ماہنامہ
الندوہ
ربیع الثانی 1431ھ/اپریل 2010ء
دنیا میں ترقی وہی لوگ کرتے ہیں
جو تنقید سہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔
الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، چھتر پارک، اسلام آباد، پاکستان۔ 46001

مجموعۂ تعوّذات
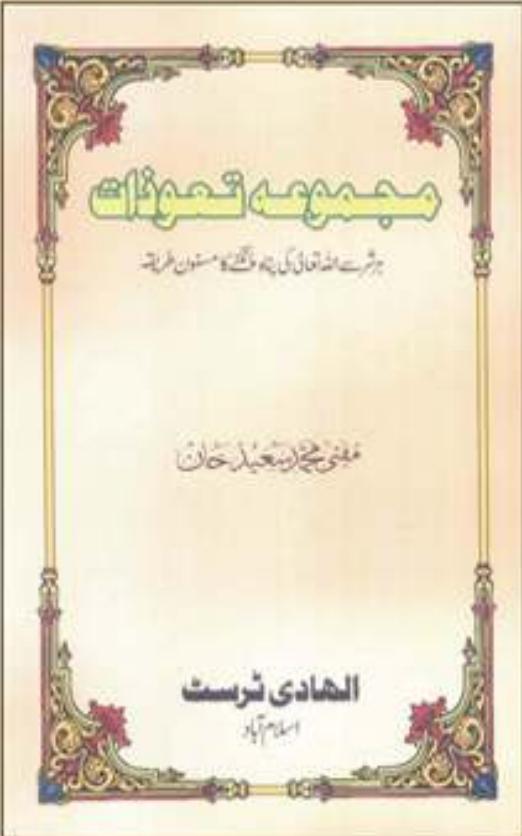
آفات ومصائب انسانی زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں ان آفات ومصائب سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل ہوجائے وہ ان تمام تکالیف سے مامون ہوجاتا ہے۔

کن الفاظ کے ذریعے پناہ مانگی جائے............؟

کتاب وسنت سے انہی الفاظ کو چن کر یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے اور ایسی دعائیں جمع کی گئی ہیں جنہیں روزانہ صبح وشام یا پھر دن میں ایک مرتبہ یا پھر ہفتے میں میں ایک بار توجہ سے پڑھنا، تعلق مع اللہ کے احساس کو اجاگر کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا.

(پ: ۱۰، س: التوبۃ، آیت: ۴۰)

اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی کی بات بلند رہی۔

الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ کا ترجمان

جلد: 1 | ربیع الثانی 1431ھ / اپریل 2010 | شمارہ: 4

مؤسس ومسؤل:

مفتی محمد سعید خان

الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، چھتر پارک، اسلام آباد، پاکستان۔ 46001

فہرست مضامین

پتہ برائے خط و کتابت:

(1) الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، چھتر پارک،
اسلام آباد۔ پوسٹ کوڈ 46001

(2) الندوہ۔ پوسٹ بکس نمبر 1940
جی۔ پی۔ او۔ اسلام آباد

E-Mail: alnadwa@seerat.net

ٹیلی فون نمبر: 0092-51-2860164

موبائل: 0300-5321111

www.seerat.net

برائے ترسیل زر:

بنام: الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ

اکاونٹ نمبر 01-8637741-01

سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک پاکستان.

پاکستان فی پرچہ: 25 روپے

پاکستان سالانہ: 300 روپے

بیرون ملک سالانہ: 25 امریکی ڈالر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب الفرقان

عَلَفْتُهَا تبنا وماءً باردًا

(میں نے اسے (اونٹنی) کو چارہ کھلایا اور ٹھنڈا پانی)

اردو زبان میں قرآن حکیم کے تراجم تین طرح سے کیے گئے ہیں.

(1) وہ تراجم جو "لفظی تراجم" یا "لغوی تراجم" کہلاتے ہیں اور ان میں قرآن حکیم کے ہر ہر عربی لفظ کے نیچے اس کا اردو ترجمہ ملتا ہے. موجودہ دور میں بہت سے حضرات نے یہ کاوش کی ہے لیکن بطورِ مثال وہ ترجمہ لیا جا رہا ہے. جس کا انتساب حضرت شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کیا جاتا ہے[1] وہاں پر سورۃ الفاتحہ کے ترجمے کا آغاز یوں کیا گیا ہے.

الحمد للہ رب العلمین. سب تعریف واسطے اللہ کے جو پروردگار عالموں کا.

---

[1] مدت سے جس ترجمے کو حضرت شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے اور عرصہ دراز سے چھپ بھی رہا ہے، اس کو یقینی طور پر حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ کہنا محلِ نظر ہے اگر چہ عوام وخواص میں یہی مشہور ہے لیکن خیال ہے کہ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو رواج پا گئی ہے امید ہے کہ آئندہ کسی وقت "الندوہ" میں اس غلطی کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی جائے گی اور یہ عرض کیا جائے گا کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس ترجمے کا انتساب درست نہیں ہے.

یہ لفظی ترجمہ ہے اور اس میں "ال" کا ترجمہ سب "حمد" کا ترجمہ تعریف "ل" کا ترجمہ واسطے "اللّٰہ" کا ترجمہ اللہ "رب" کا ترجمہ پرودگار اور "العٰلمین" کا ترجمہ عالموں کا، کیا گیا ہے. یہ ترجمہ جس وقت بھی ہوا تھا وہ اردو زبان کا بالکل ابتدائی دور تھا. اس طرح لفظ بلفظ ترجمہ کرنا اس دور میں بھی آسان تھا اور اب بھی آسان ہے اگر عربی اور اردو لغت اور دونوں کے قواعد سے واقفیت ہو تو یہ مرحلہ با آسانی طے کیا جا سکتا ہے.

(2) دوسرا اردو ترجمہ وہ ہے جو "بامحاورہ" یا "اصطلاحی ترجمہ" کہلاتا ہے اور یہ ترجمہ کرنا بہت دشوار ہے. پوری آیت کریمہ کو سامنے رکھ کر یہ پابندی کہ قرآن کریم کے کسی لفظ کا ترجمہ چھوٹنے بھی نہ پائے، اردو زبان کا ڈھنگ اور محاورہ بھی قائم رہے، اِس کے ساتھ ساتھ ترجمہ سلیس بھی ہو اور شریعت کی دیگر نصوص اور آیاتِ قرانیہ سے بھی نہ ٹکرائے، جان جوکھوں کا کام ہے. جو اس مرحلے سے گزرے ہیں، جانتے ہیں کہ ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر پہروں سوچنا پڑتا ہے. بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز تر ایک یہ بھی راہ ہے، جسے سر کرنا پڑتا ہے. دانتوں پسینہ آتا ہے اور توفیقِ خداوندی شامل حال نہ ہو تو بغیر تقویٰ کے محض علم کے زور پر بھی یہ ہفت خواں سر نہیں کیا جا سکتا.

اردو زبان میں قرآن کریم کے بامحاورہ ترجمے کا "بیڑا"[1] حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی

---

[1] (بیڑا اُٹھانا) یہ خالص اردو زبان کا محاورہ ہے اور اس کا مطلب ہے کسی مشکل کام کی انجام دہی کا ذمہ قبول کرنا یا پختہ عہد کر لینا یا عزم بالجزم کر لینا. ہر قوم کے افراد میں یہ رسم پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی قسم کو عملی طور پر یقینی بنانے اور اس بات کے اظہار کے لیے کہ وہ اس قسم کو پورا کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے، کوئی نہ کوئی عمل کرتے ہیں. مثلاً عرب اس مقصد کے لیے خون یا مائع خوشبو ایک پیالے میں ڈال کر اپنا ہاتھ اس میں ڈبو کر قسم کھایا کرتے تھے. ایسے ہی ہندوستان میں پان کے پتے کو چونکہ ہندو مقدس مانتے تھے اس لیے اپنی قسم میں مزید پختگی کے اظہار کے لیے پان کا پتہ اٹھا کر قسم کھایا کرتے تھے. پان کو "بیڑا" بھی کہا جاتا ہے اس لیے پان کا پتہ اٹھانے کو بیڑا اٹھانا کہا جاتا ہے. اس لیے "بیڑا" اٹھانے کا مطلب بھی یہی ہے کہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قسم کا عملی اظہار، یا مصمم ارادے کا ....

رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھایا اور یہ سہرا، ولی اللّٰہی خاندان کے اس عظیم اور سعادت مند فرزند کے سر پر ہی بندھا. اردو زبان ابھی گھٹنیوں چل رہی تھی، لیکن اس کی تعمیر اور اُٹھان میں اس ترجمے نے بھرپور حصہ لیا. حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُن لوگوں میں سے تھے جو کسی بھی زبان کو الفاظ اور محاورات سے مالا مال کیا کرتے ہیں. اس ترجمے کو پڑھیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ نئے سے نئے الفاظ، اعلیٰ سے اعلیٰ محاورات اور عمدہ عمدہ سے ترکیبیں ڈھل ڈھل کر آرہی ہیں. زبان کی ٹکسال ہے کہ بنام اردو سکہ سازی ہو رہی ہے. اور ان کی کھنک سے قوت سامعہ اب تک لذت گیر ہے. ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے سچ لکھا ہے:

''جب ایک خاندان کے ایک چھوڑ تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے، ایک فارسی مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا، اکٹھے دو دو اردو، ایک شاہ عبدالقادر

.... بیان یا کسی مشکل کام کی ذمہ داری اُٹھانا. اگلے زمانوں میں ہندو راجہ اور بادشاہ کوئی سخت مشکل کام جب اپنے ماتحتوں کے سپرد کرتے تھے تو وعدہ کرتے تھے کہ اس کام کو ضرور سرانجام دیں گے اور اس محفل کے آخر پر ہر ایک کے سامنے پان (بِیڑا) رکھا جاتا تھا اور وہ اس کو اٹھا کر کھا لیتا تھا تو یہ کام کرنا، اس ماتحت پر فرض، ضروری ہو جاتا تھا. اس رسم کو ''بِیڑا اُٹھانا'' یا ''بِیڑا ڈالنا'' یا ''بِیڑا ارکھنا'' کہتے تھے.

استاد ذوق دہلوی مرحوم نے فرمایا ہے:

گلوری پان کی غیروں کو تم کھلاتے ہو ہمارے قتل کا ''بِیڑا'' کہیں اُٹھاتے ہو

استاد اسیر مرحوم فرماتے ہیں:

مجلس میں پان دیجیے پیچھے رقیب کو پہلے ہمارے قتل کا ''بِیڑا'' اُٹھایئے

عوام الناس میں اس لفظ ''بِیڑا'' کو ''بیڑا'' بولتے ہیں. جو کہ غلط ہے. اصل لفظ ''بِیڑا'' اور اسے ایسے ہی یعنی ''ب'' کی زیر (ِ) کے ساتھ تلفظ کرنا چاہیے (ملاحظہ ہو. اردو لغت، ترقی اردو بورڈ کراچی. مادہ: بِیڑا، ج:۳، ص:۱۵۴۰، اور فرہنگ آصفیہ، مادہ: بِیڑا، ج:۱، ص:۴۶۵)

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اور ایک شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تو اب ہر ایک کو ترجمہ کا حوصلہ ہو گیا. مگر خاندانِ شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا. وہ ہرگز مترجم نہیں بلکہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہے کہ انہی ترجموں میں اس نے ردوبدل، تقدیم و تاخیر کر کے جدید ترجمہ کا نام کر دیا ہے۔[1]

(3) "تفسیری ترجمہ" یہ وہ ترجمہ ہے جو پہلے دونوں تراجم کا مجموعہ ہے. اور یہ اس لیے کیا گیا کہ "لفظی تراجم" کو سمجھنے میں بہت دقت ہوتی تھی اور پھر اردو عبارت کا نظم اور ترتیب بھی قائم نہیں رہتی تھی مثلاً (پ: ۱، س: البقرہ، آیت: ۲) کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

ذلك الكتاب لا ريب فيه. یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے.

اس ترجمے میں اگرچہ یہ خوبی ہے کہ پڑھنے والے کو ہر ہر لفظ کا ترجمہ معلوم ہو جاتا ہے لیکن فقرے کا تسلسل قائم نہیں رہتا. اور جب تک کوئی شخص بہت دقتِ نظر سے نہ پڑھے تو بسا اوقات تو آیت کا ترجمہ صحیح طور پر سمجھنا ہی دشوار ہو جاتا ہے.

اور دوسرے ترجمے میں، دقت یہ کہ بعض حضرات نے ترجمہ بامحاورہ اور آسان تو کر دیا لیکن وہ ایسا غلط ہوا کہ معانی تبدیل ہی ہو گئے. قرآن کریم کی فصیح عربی کو اردوئے مبیّن میں منتقل کرتے کرتے اصل کلام ہی بدل گیا. اس کی ایک بہت واضح مثال مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ترجمہ ہے انہوں نے (پ: ۱، سورۃ الفاتحہ، آیت: ۷) کا ترجمہ کیا ہے.[2]

غيرا لمغضوب عليهم ولا الضالين. جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں.

اب یہاں پر "مغضوب" کا ترجمہ "معتوب" کیا گیا ہے. معتوب کا لفظ خوبصورت ہے لیکن سمجھنے کی

---

[1] مقدمہ ترجمہ قرآن از ڈپٹی نذیر احمد صاحب، ص: ۹.

[2] تفہیم القرآن، ج: ۱، ص: ۴۵.

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کچھ لوگوں پر اپنے غضب کا اظہار فرمایا ہے. اور " غـضـب " کے معنی ہیں غصہ یا ناراضگی بلاشبہ کافروں پر اللہ تعالیٰ کا غضب رہا ہے اور "عتـاب" کے معنیٰ ہیں کہ محبوب کی لاپروائی پر محبت بھری ناراضگی کا اظہار.

اب التفات اسے کہیے خواہ بے زاری
خطا کسی کی ہو، مجھ پر عتاب ہوتا ہے

عتاب تو حضرات انبیاء علیہم السلام پر بھی ہوا ہے. غضب کی بنیاد انتقام یا سزا دینا ہے اور عتاب کی بنیاد محبت کے ساتھ لغزش پر تنبیہ کرنا ہے. سو دونوں میں بہت فرق ہے. جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا، وہ " معـتـوب " نہیں تھے، "مغضوب" تھے اور جن پر اللہ تعالیٰ نے " عتـاب " فرمایا وہ "معتوب" ہوئے " مغضوب " نہیں.

حضرت شاہ ولی صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے " المقدمہ فی القوانین الترجمة "[1] میں اسی طرح کے طرزِ ترجمہ کے متعلق بتایا ہے کہ تورات وانجیل میں تحریف کا آغاز ایسے ہی ہوا تھا.

متذکرہ بالا مثال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے نے اگرچہ یہ غلطی ارادتاً نہیں کی لیکن مترجم کی بے احتیاطی یا پھر لاعلمی کی وجہ سے ایسی غلطی ترجمے میں راہ پا گئی، جس کا سمجھنا عوام تو کجا خواص کے لیے بھی دشوار ہے. بہت سے مترجمین کی ایسی بے شمار اغلاط موجودہ تراجم میں پائی جاتی ہیں.

ان دونوں تراجم (۱) لغوی یا لفظی ترجمہ (۲) بامحاورہ یا اصطلاحی ترجمہ کی کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہ تیسری قسم کا ترجمہ رائج ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ عربی کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے جو دشواریاں پیش آتی ہیں اور ترجمہ سمجھنے یا سمجھانے کے لیے اردو کے جن الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے، اُن کا استعمال بھی کیا جائے، حروف کا ترجمہ بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے، محاورہ اور زبان کا نظم بھی قائم رہے، اور پڑھنے والے کے لیے بھی سمجھنے میں چنداں دشواری نہ ہو.

---

[1] دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں اس کا مسودہ دیکھا تھا صرف چند صفحات پر مشتمل ہے.

اس تیسری قسم کے ترجمے کی ایک مثال خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف "فتح الرحمن" بھی ہے اور اردو میں یہ مثال حضرت مولانا فتح محمد صاحب جالندھری اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کے تراجم ہیں. ان کو ذرا غور کرکے سمجھا جائے تو ترجمے کا شغف رکھنے والے حضرات کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اگرچہ یہ تراجم آزادی سے، عام فہم کیے گئے ہیں لیکن کہیں بھی حدود سے تجاوز یا بے راہ روی نہیں ہے.

ہر مکتبۂ فکر کے علماء اب بھی اس طرح کے ترجمے کے کام میں مصروف ہیں اور کوئی برس جاتا ہے کہ نیا ترجمہ نہیں آتا اور بعض حضرات نے تو اس کام کو اتنا سہل جانا ہے کہ عربی زبان کے بنیادی قواعد تک نہیں جانتے، لیکن ترجمہ وتفسیر قرآن میں بے کار عمر کھپا رہے ہیں. گمراہی پھیلنے کا یہ بھی ایک سبب اور بہت بڑا سبب ہے اور اس سبب کے تہہ میں بھی ایک بات ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے نیازی، خوف خدا کا نہ ہونا، اور تقویٰ کی راہ سے بھٹکی ہوئی زندگی.

ان لوگوں کے برعکس کچھ مخلصین اور متقی حضرات اس کام کا بیڑا بھی اٹھائے ہوئے ہیں کہ قرآن فہمی کو عام کیا جائے. لوگوں کو شرک وبدعت سے بیزاری اور کتاب وسنت کی راہ کو اپنانے کا سبق دیا جائے ان حضرات کی ان مبارک مساعی کی بنیاد تقویٰ اور تعلق مع اللہ ہے. انہی مخلصین کی کوششوں میں حصہ ڈالنے کی غرض سے یہ عرض کیا جاتا ہے کہ:

(1) عربی زبان میں کبھی ایک کام کا تعلق اس کام کے کرنے والے سے جوڑا جاتا ہے. اور دوسرے کام کا تعلق دوسرے کام کرنے والے کے ساتھ جوڑا جاتا ہے. اردو میں آپ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک شخص کہتا ہے "میں نے کھانا کھایا اور پانی پیا" اب اس ایک شخص نے دو کام کیے. کھانا کھایا اور پانی پیا. دو چیزوں یعنی کھانا اور پانی، کے لیے دو فعل لایا "کھایا اور پیا" کھانا کے ساتھ "کھانے" کا فعل اور پانی کے ساتھ "پینے" کا فعل. اب اگر وہ یہ جملہ ایسے کہتا "میں نے کھانا کھایا اور پانی" تو زبان جاننے والے اساتذہ اسے بتاتے کہ یہ جملہ نامکمل ہے یوں کہیے "میں نے کھانا کھایا اور پانی پیا"

عربی زبان میں ایسے نہیں ہے بلکہ وہاں پر فعل تو کبھی ایک ہی ذکر کیا جاتا ہے اور اس ایک فعل کے ساتھ دو چیزیں متعلق کر دی جاتی ہیں.

اب یہ پڑھنے یا سننے والے کی ذہانت ہے کہ وہ اس کلام کو سمجھے. پہلی چیز کے ساتھ پہلے فعل کا ذکر بالکل واضح ملے گا لیکن دوسری چیز کے ساتھ دوسرے فعل کا ذکر نہیں ہوگا. اب یہ پڑھنے یا سننے والے کی ذہانت ہے کہ وہ دوسری چیز کے ساتھ، اس سے متعلقہ فعل کو بھی تلاش کرے، کہ یہاں پر کون سا فعل لانا مناسب رہے گا.

مثلاً لغت کے امام اور مشہور عرب شاعر فراء یہ کہتے ہیں:[1]

عَلَفْتُها تبناً وماءً بارداً   حتیٰ شتت همالة عيناها

میں نے اونٹنی کو چارہ کھلایا اور ٹھنڈا پانی، یہاں تک کہ سیرابی کی وجہ سے اس کی آنکھیں کھل گئیں.

اب اس شعر کے پہلے مصرعے کے معانی پر غور کیجیے تو اس میں ''کھلانا'' ایک فعل ذکر کیا گیا اور اس کے بعد چیزیں دو ہیں یعنی

① گھاس

② ٹھنڈا پانی

اب کھلایا تو صرف چارہ ہی جاتا ہے، پانی کو تو کوئی نہیں کھلاتا، پانی تو پلایا جاتا ہے. اس لیے یہ کہا جائے گا کہ اگرچہ شاعر نے یہ کہا ہے کہ میں نے اُس اُونٹنی کو چارہ کھلایا اور ٹھنڈا پانی، لیکن ہم اس ''ٹھنڈے پانی'' سے پہلے ایک اور فعل ''پلانے'' کا اضافہ کریں گے تا کہ مصرع مزید نکھر جائے اور پھر یہ مصرع یوں پڑھا جائے گا کہ:

''عَلَفْتُها تبناً وسقيتها ماءً بارداً''   میں نے کھلایا اس اونٹنی کو چارہ اور پلایا اُسے ٹھنڈا پانی

اہل علم جب اس بحث کو اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ مفعول معہ کی بحث میں عموماً ایک

---

[1] لسان العرب، مادہ: علف، ج: ۹، ص: ۴۱۰.

فعل کے ساتھ ایک معمول کا تعلق ہوتا ہے اور دوسرے فعل کے ساتھ دوسرے معمول کا لیکن کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی فعل کے ساتھ دو معمول ذکر کر دیے جاتے ہیں. فعل پہلے معمول کے ساتھ تو درست ہوتا ہے لیکن دوسرے معمول کے لیے دوسرا فعل تلاش کرنا پڑتا ہے تا کہ ظاہر بین کی نظر دھوکہ نہ کھائے.

اس قاعدے کی تشریح کے لیے ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے.

چوتھی صدی ہجری کے مشہور شاعر احمد بن حسین ابوالطیب المتنبی (پیدائش ۳۰۳ھ) نے عیدالاضحیٰ ۳۴۲ھ کے موقع پر اپنے ممدوح سیف الدولۃ کو عید کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے ایک قصیدہ کہا اور اسی قصیدے میں ایک مقام پر کہتا ہے:[1]

ذَاتِ فَرْعٍ كَأَنَّمَا ضُرِبَ الْعَنْبَرُ   فِيْهِ بِمَاءِ وَرْدٍ وَعُوْدٍ

وہ محبوبہ جس کے سر کے بالوں کی خوشبو ایسی مسحور کن کہ گویا عنبر کو عرق گلاب اور عود کے پانی میں گھول کر اس مرکب خوشبو کو اس کے بالوں میں رچایا گیا ہو.

اب اس شعر میں عنبر کو گھولا گیا ہے ایک تو گلاب کے پانی میں (یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے) اور دوسرے عود کے پانی میں تو عود کی لکڑی کے پانی میں نہ خوشبو ہوتی ہے اور نہ ہی یہ لکڑی اس مقصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے بلکہ عود کو تو جلا کر دھونی دی جاتی ہے.

اس لیے اس شعر کے دوسرے مصرع میں ایک فعل (دخن) اپنے پاس سے بڑھا کہ اس شعر کو سمجھنے کے لیے گویا کہ اسے یوں پڑھا جائے گا.

ذَاتِ فَرْعٍ كَأَنَّمَا ضُرِبَ الْعَنْبَرُ   فِيْهِ بِمَاءِ وَرْدٍ وَدُخِنَ عُوْدٍ

وہ محبوبہ جس کے سر کے بالوں کی خوشبو ایسی مسحور کن کہ گویا عنبر کو گلاب میں گھول کر اس کے سر میں رچایا گیا ہے اور عود کی دھونی دی گئی ہے.[2]

---

[1] دیوان المتنبي، قافية الدال ، كم قتيل كما قتلت شهيد.

[2] شرح ديوان المتنبي، عبدالرحمن البرقوتي، قافية الدال، ج: ١، ص: ٣٤٧.

عربی ادب میں اس طرح کی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ فعل ایک اور اس کے مفعول معہ دو اور پھر اس کے دوسرے مفعول معہ کے لیے ایک اور فعل تلاش کیا جائے گا۔[1]

قرآن کریم کی متعدد آیات کو سمجھنے کے لیے یہ اصول بہت کارآمد ہے۔ اور قرآن حکیم کا ترجمہ کرتے ہوئے اگر مترجم کے پیشِ نظر یہ اصول نہیں رہا تو پھر فصیح ترجمہ نہیں کیا جا سکے گا بلکہ ایسی آیات بھی مل جائیں گی جہاں اس اصول کو جانے بغیر نہ صرف یہ کہ قرآن حکیم کی وہ آیت سمجھ ہی میں نہیں آسکتی بلکہ اُن مقامات پر یہ ڈر ہے کہ کہیں کوئی انسان بجائے ہدایت حاصل کرنے کے اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک سے ہٹ کر اہل بدعت ہی میں شامل نہ ہو جائے۔ اس لیے قدیم مفسرین اور مترجمین جا بجا اس قاعدے کو استعمال کرتے ہوئے نظر آئیں گے اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر موجودہ دور تک عربی تفاسیر اور اردو زبان میں بعض اہل علم کی تفاسیر میں اس قاعدے کا تذکرہ ملے گا۔

اس لیے قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر کرنے والے اگر اس اصول کو نہیں جانتے تو پھر انہیں اس وادی میں اترنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرنی چاہیے مبادا کہ قرب خداوندی کے بجائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ناراضگی مول لے لیں۔

بعض غیر مسلم معترضین نے قرآن حکیم کی بعض آیات کے غیر مربوط ہونے کا جو الزام عائد کیا ہے وہ درحقیقت عربی زبان کے اس قاعدے سے ہی ناواقفیت کا نتیجہ ہے اس لیے اہل علم کو چاہیے کہ اس اصول کو خود بھی سمجھیں اور پھر جب ترجمہ یا تفسیر قرآن حکیم تحریر فرمائیں یا اپنے شاگردوں کو پڑھائیں یا عوام میں تفسیر بیان کریں تو اس اصول اور قاعدے کو ضرور واضح کرتے رہیں۔

---

[1] اہل علم کو چاہیے کہ اس بحث کو مزید سمجھنے کے لیے علم نحو کی امہات کا مطالعہ کریں۔ مثلاً (١) شرح الرضي علی الکافیة، احکام المفعول معه، ج:١، ص:٥١٧. (٢) النحو الوافي، المسألة: ٨٠، المفعول معه، ج: ٢، ص:٢٨٢ (٣) المقتضب للمبرد، المجازات وحروفها، ج: ٢، ص: ٥٠. (٤) شرح ابن عقیل المفعول معه، ج:١، ص: ٤٦٤.

اب ذیل میں اس اصول اور قاعدے کا استعمال، آیات قرآنی میں ملاحظہ ہو.

(1) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ. (پ:۲۸، س: الحشر، آیت: ۹)	اور مال میں ان لوگوں کا حق بھی ہے جو ان مہاجرین کی آمد سے قبل ہی مدینہ منورہ میں مقیم تھے اور ایمان کے ساتھ.

اس آیت کریمہ میں "فعل" صرف ایک استعمال کیا گیا ہے یعنی "تبوّؤا" .اور اس فعل کی اصل، لفظ "اَلْبَوَاءُ" ہے. "اَلْبَوَاءُ" کے اصل معنی (۱) کسی چیز کی طرف رجوع کرنا (۲) دو چیزوں کا آپس میں برابر اور موافق ہونا، کے آتے ہیں محاورہ ہے.

بَوَّأْتُ الرُّمْحَ — میں نے مناسب جگہ پر نیزہ مارا

یعنی ایک تو دشمن کو نیزہ مارنا مطلوب تھا اس لیے اس دشمن کی طرف رجوع کیا اور پھر نیزہ جس مقام پر مارنا چاہیے تھا، وہی مقام زخمی ہوا تو محاورے میں حسب حال "بَوَّأْتُ" کا لفظ استعمال کیا گیا.

حضرت ابوجندل عبید بن حصین نے اونٹوں کے چرواہے کی تعریف میں کہا ہے.

لها أمرها حتیٰ إذا ما تبوأت — بأخفافها مأوی تبوأ مضجعا

چرواہا اونٹ چرنے کے لیے کھول دیتا ہے اور پھر جب وہ چرنے کی مطلوبہ اور ہموار جگہ پا لیتے ہیں تو یہ اپنے ٹھکانے پر آ کر اطمینان سے سو جاتا ہے.

اَلْبَاءَةُ لفظ اشارے اور کنایے میں جنسی تعلقات لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھی دونوں فریق ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دونوں کا آپس میں توافق ہو جاتا ہے.

انسان جب یہ چاہتا ہے کہ اپنے لیے یا اپنی اولاد کے لیے یا کسی اور کے لیے گھر بنائے تو سب سے پہلے زمین تلاش کرتا ہے اور پھر اس زمین کو جھاڑ جھنکار سے صاف اور ہموار کرتا ہے تو اس تمام محنت اور کاوش کے لیے عرب یہ بولتے ہیں.

بوأت له مكاناً — میں نے اس کے لیے زمین کو تلاش کر کے ہموار اور درست کیا۔[1]

تو سورۂ حشر کی متذکرہ بالا آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان انصار نے ان مہاجرین رضی اللہ عنہم کی ہجرت سے قبل ہی اپنے لیے گھر بنا رکھے ہیں تو "تبوّءُ" فعل کا تعلق تو "الدار" (گھر) سے ہوا لفظِ ایمان سے نہیں ہوا پھر اس لفظ کو واضح کرنے کے لیے کیا کیا جائے گا؟ اس لیے اردو یا کسی بھی زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے "ایمان" کے لیے کوئی مناسب فعل لانا پڑے گا، تب جا کر ترجمہ بہت مناسب اور واضح ہوگا۔ اس مقصد کے لیے جب بلاغتِ قرآنی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو پھر معلوم ہوتا ہے کہ اب یہاں پر یہ قاعدہ استعمال کرنا پڑے گا۔

"علفتها تبنا وماءً باردا"

ابن الشجری نے اپنی "أمالي" میں اس قاعدے کا استعمال کرتے ہوئے "ایمان" سے قبل ایک اور فعل کا اضافہ کیا ہے اور ان کے نزدیک اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تشریح یوں ہوگی۔[2]

والذين تبوؤا الدار وأحبّوا الإيمان. — اور اس مال میں ان لوگوں کا حق بھی ہے جو ان مہاجرین کی آمد سے قبل ہی مدینہ منورہ میں اپنے گھروں میں سکونت پذیر ہیں اور جن کے دلوں میں ایمان کی محبت رچ بس گئی ہے۔

---

[1] أصل البواء مساواة الأجزاء في المكان خلاف النبوة الذي هو منافاة الأجزاء وبوات الرمح هيأت له مكاناً ثم قصدت الطعن به.(المفردات، للراغب الأصفهاني، مادة، (ب و ء)ص:٦٩)، بوأ: الباء والواو والهمزة أصلان: أحدهما الرجوع إلي الشيء، والآخر تساوي الشيئين. (معجم مقاييس اللغة، مادة، (ب و ء)ص:١٥٧).

[2] علفتها تبناً وماءً باردا وسقيتهاوقد قيل في قول الله سبحانه ﴿والذين تبوؤا الدار والايمان﴾ ......

اب غور کیجیے تو "احبوا" (فعل، محبت کرتے ہیں) کا اضافہ کرکے ہی ترجمہ واضح ہوتا ہے اور اس طرح ہمیں ایک مزید فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ اس سے انصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ کی مدح بھی واضح اور ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان سے ان کی محبت اور ایمان کے ان قلوب میں رچ بس جانے کو سراہا ہے.

بعض اہل لغت نے اس آیتِ کریمہ میں لفظ ایمان سے پہلے "اخلصوا" کے فعل کو ذکر کیا ہے[1] تو پھر اس صورت میں یہاں پر ترجمہ اور تشریح یہ بنے گی.

والذین تبوؤا الدار واخلصوا الایمان. — اس مال میں ان لوگوں کا بھی حق ہے، جو ان مہاجرین کی آمد سے قبل ہی مدینہ منورہ میں اپنے گھروں میں سکونت پذیر ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو خالص کرلیا ہے.

اب یہ ترجمہ بھی واضح ہوگیا اور یہاں پر بھی ایک مزید فائدہ یہ حاصل ہوا کہ انصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کے خالص ہونے کی گواہی (جو خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے) بھی قارئین کے علم میں آگئی اور بلاشبہ یہ انصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی منقبت ہے.

اس موقع پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اور ان کا اخلاص قرآن کریم کی دیگر آیات اور احادیث صحیحہ سے روز روشن کی طرح ثابت ہے. اور اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ اسے محض لغت کے بل بوتے پر ثابت کیا جائے. البتہ ضمنی طور پر جو فوائد لغوی قواعد سے حاصل ہو

.... ان المعنى وأحبوا الايمان أمالي ا بن الشجري من شعر كتاب سيبويه قول خزز بن لوذان السدوسي، المجلس الخامس والسبعون، ج: ٣، ص: ٨٣.

[1] الكلام من باب: علفتها تبناً وماءً بارداً. أي تبؤوا الدار وأخلصوا الايمان. الجدول في الا عراب القرآن لمحمود صافي، سورة: الحشر، ج: ١٤، ص: ٢٠١.

رہے ہیں اُن کا بیان بھی ضروری ہے.

بعض حضرات نے کسی بھی فعل کے بجائے اس آیت کریمہ میں آنے والے اسم "الدار" ہی کو مکرر مان کر "الایمان" سے قبل "الدار" کا اضافہ تسلیم کیا ہے اور اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تشریح یوں کی ہے کہ:

والذین تبوّؤادار الهجرة و دار الایمان.	جو حضرات ان مہاجرین کی آمد سے قبل ہی اس ہجرت کے مقام (مدینہ منورہ) اور اس ایمان کی جگہ میں سکونت پذیر ہیں.[1]

اگر قرآن حکیم کی یہ بلاغت مان لی جائے تو پھر ایک نیا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بجائے مدینہ منورہ کی حرمت وعظمت زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پاکیزہ شہر کو ہجرت کا ٹھکانہ اور ایمان کی جگہ قرار دیا ہے.

(2) اس قانون (علفتها تبناً و ماءً ابارداً) کی دوسری مثال بھی ملاحظہ ہو.

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دوست، دوستوں کی مدد کب کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں جب کسی شخص کو مصیبت پیش آتی ہے یا وہ دشمنوں کے مقابلے میں شکست کھا رہا ہوتا ہے یا مصائب اور تکالیف میں گھر جاتا ہے تو دوست غیروں کے مقابلے میں اپنے اس دوست کی مدد کرتے ہیں.

کیا قیامت میں بھی ایسی صورت حال پیش آئے گی؟ یقیناً نہیں. کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بلاشبہ وہ دن تکالیف و مصائب سے بھرپور ہوگا لیکن وہاں کسی شخص کا کسی سے نہ تو کوئی مقابلہ ہو رہا ہوگا اور نہ ہی انسانوں کی آپس میں کوئی جنگ ہوگی کہ کوئی اور کسی کی مدد کرے بلکہ وہاں تو سب لوگ کسی کی مدد کے محتاج اور منتظر نہیں ہوں گے، احتیاج ہوگا تو فقط رحمت باری تعالیٰ کا اور نظر ہوگی تو محض اس وحدہ لا شریك کے کرم پر.

---

[1] والایمان بالنصب عطفاً علی (الدار) ایضاً. والبرهان في اعراب آيات القرآن س: الحشر الآية (٧-٩)، ج:٦، ص:٣٥٣.

غیروں کی مدد اور اللہ تعالیٰ کی رحمت میں یہ باریک فرق ہے اسے سمجھنا چاہیے کہ قیامت میں لوگ اللہ تعالیٰ کی مدد کے کسی کے مقابلے میں محتاج نہیں ہوں گے بلکہ اس کی رحمت کے محتاج ہوں گے۔اب اس آیت کریمہ کو پڑھیے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ.
(پ:٢٤، س: المومن، آیت:٥١)

یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور اُن لوگوں کی جو ایمان لائے ہیں اس دنیا میں مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی کریں گے جب گواہی دینے والے (گواہی دینے کے لیے) کھڑے ہوں گے۔

اس دنیا میں تو اللہ تعالیٰ کا مدد کرنا سمجھ میں آتا ہے۔مصائب اور تکالیف میں مدد کرنا اور دشمنوں کے مقابلے میں مدد کرنا وغیرہ وغیرہ لیکن قیامت میں کس چیز کے مقابلے میں مدد کی جائے گی؟ وہاں تو رحمت کی ضرورت ہوگی۔اس لیے ہمارے اساتذہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ قرآن حکیم میں اس مقام پر نصرت کا تعلق حیاتِ دنیوی سے ہے اور حیاتِ اُخروی یا قیامت کے متعلق ایک اور فعل تجویز کیا جائے گا تاکہ اس آیت کریمہ کا زیادہ مناسب ترجمہ اور تشریح ہو جائے۔چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے:

انا لننصر رسلنا والذين أمنوا في الحيوة الدنيا ونرحمهم يوم يقوم الأشهاد.

یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور اُن لوگوں کی جو ایمان لائے ہیں، اس دنیا میں مدد کرتے ہیں اور اس دن ان پر رحم کریں گے، جب گواہی دینے والے (گواہی دینے کے لیے) کھڑے ہوں گے۔

یہ اُن اساتذہ کا موقف تھا جن کی قرآن فہمی مسلم تھی۔رحمہم اللہ۔اگرچہ عام طور پر مفسرین نے اس نصرت یا مدد کو دونوں جہاں کے لیے عام مانا ہے۔دنیا میں تکالیف، مصائب اور دشمنوں کے مقابلے میں اور قیامت میں اس دن کے شدائد سے چھٹکارے کے لیے اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔

(3) اس قانون کی تیسری مثال ملاحظہ ہو. قیامت میں جب اہل جنت وجہنم کا فیصلہ ہو جائے گا اور ہر گروہ اپنے ٹھکانے پر جا پہنچے گا تو اہل جہنم، اہل جنت سے ایک درخواست کریں گے. اللہ تعالیٰ نے اس درخواست کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ:

وَنَادَىٰ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا۟ عَلَيْنَا مِنَ ٱلْمَآءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ ٱللَّهُ. (پ:۸، س: الاعراف، آیت: ۵۰)	اور جہنم والے، جنت والوں سے کہیں گے کہ بہادو ہم پر تھوڑا سا پانی یا پھر وہ رزق (کھانا، پھل، وغیرہ) جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے.

آیت کریمہ میں لفظ استعمال ہوا ہے "افیضوا" اور اس لفظ کا اصل مادۃ (ف۔ی۔ض، فیض) ہے اور اس کے اصل معنیٰ "کسی چیز (پانی، بارش یا مال وغیرہ) کی کثیر مقدار کا، سہولت سے اور نمایاں ہو کر بہہ جانا" کے آتے ہیں. مثلاً پانی کی بہت زیادہ مقدار بسہولت نمایاں ہو کر بہہ پڑے یا کہیں سے چشمہ پھوٹ کر اچھلے اور بہہ پڑے یا پھر آنسو مسلسل بہنے لگیں تو ان مواقع پر یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے.[1]

" أَفَاضَ إنائه " کے معنی یہ ہیں کہ برتن پانی سے اتنا لبالب بھر گیا ہو کہ پانی اس کے کناروں سے نیچے گرنے لگا. سخی آدمی کو فیاض اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس کثرت سے مال ہوتا ہے اور پھر وہ اسے روک نہیں رکھ سکتا بلکہ امور خیر میں پانی کی طرح بہاتا ہے. حضرت رسالت مآب ﷺ نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو طلحۃ الفیاض اس لیے فرمایا تھا کہ وہ اپنا مال نیکی کے کاموں میں نہایت کثرت سے خرچ کرتے تھے.[2]

---

[1] فیض: الفاء والیاء والضاد أصل صحیح واحد یدل علي جریان الشيء بسهولة ثم یقاس علیه. من ذلك فاض الماء یفیض، أفاض إناء ه، إذا ملأه حتي فاض، وأفاض دموعه؛ (معجم المقاییس في اللغة، مادة (ف ،ض، ي)، ص :۸۳۲).

[2] فیض: فاض الماء والدمع ونحوهما یفیض فیضاً وفیوضة وفیوضاً و فیضاناً وفیضوضة أي کثر حتي سال علي ضفة الوادي. وفاضت عینه تفیض فیضاً إذا سالت و رجل فیاض أي وهاب ....

اہل جہنم جس بات کی درخواست کریں گے وہ پانی کا بہانا ہے اور یہ لفظ (بہانا) کھانے کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ "کھانے" کے لیے عربی میں " إلـقـاء " اور اردو میں، عطا کرنا، نوش کرنا، دینا، یا جانوروں کے سامنے کھانا ڈالنا کے محاورات استعمال ہوتے ہیں۔

سو آیت کریمہ میں ترجمے کے اعتبار سے بہانے (افیضوا) کا لفظ "پانی" کے لیے تو استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن "کھانے" کے لیے یہ لفظ نہیں آئے گا۔ "کھانا بہانا" یہ محاورہ نہ اردو میں ہے اور نہ عربی میں۔ اس لیے پھر یہاں وہی قاعدہ استعمال کرنا پڑے گا۔

"علفتها تبناً و ماءً ا باردا".

اور "رزق" "کھانے" کے لیے کوئی اور فعل تلاش کریں گے۔

زمخشری لکھتا ہے کہ کھانے کے لیے "القاء" "ڈالنے" کا فعل اختیار کرنا پڑے گا۔[1]

سو اس آیت کریمہ کا زیادہ بہتر اور سلیس ترجمہ یہ ہوگا کہ گویا اہل جہنم نے اہل جنت سے یہ درخواست کی:

ان افیضوا علینا من الماء او ألقوا علینا مما رزقکم اللّٰہ.	کہ کچھ پانی ہم پر بہا دو یا پھر اللہ تعالیٰ نے جو کھانا تمہیں دیا ہے ہماری طرف ڈال دو یا پھینک دو۔[2]

علامہ قمی نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر " غـرائـب الـقـرآن و رغـائب الفرقان " میں بھی یہی بات لکھی ہے۔[3]

...........جواد. لسان العرب، مادة (ف، ض، ي)، ج:١٠، ص:٤٠٧.

[1] ﴿او مـمـا رزقـكـم الله﴾ من غيره من الأشربة لد خوله في حكم الإفاضة، ويجوز أن يراد ألقوا علينا مما رزقكم الله من الطعام والفا كهة. كقوله:علفتها تبنا وماءً باردا. تفيسر الكشاف، ج: ٢، ص:١٠٨.

[2] جنت چونکہ اوپر ہوگی اور جہنم نیچے اس لیے اوپر سے کھانا پھینکا جاسکے گا یا پھر ڈالا جاسکے گا۔ یہی ترجمے زیادہ مناسب بنتے ہیں اس لیے ترجمے میں یہی محاورات اختیار کیے گئے ہیں۔

[3] والمراد : وألقوا علينا من الطعام والفاكهة ككقوله علفتها تبناً وماءً باردا ، ج :٣ ، ص: ٢٤١.

بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہاں پر فعل " اُلقوا " (ڈالو، پھینک دو) کی بجائے " أطعمونا " (ہمیں کھلاؤ) آنا چاہیے۔ اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو پھر بات یوں بنے گی کہ اہل جہنم نے کہا:

ان افیضوا علینا من الماء أو أطعمونا مما رزقکم اللّٰہ.	کہ کچھ پانی ہم پر بہادو اور یا پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کھانا دیا، اس میں سے کچھ ہمیں کھلادو۔[1]

متذکرہ بالا دونوں صورتوں میں سے، صورت کوئی بھی لے لی جائے، ہوگی وہ اسی قاعدے کے مطابق

ع علفتها تبناً و ماءً اباردا.

(4) اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان میں ارشاد فرمایا ہے:

وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا. (پ:۱۹، آیت:٤٧).	اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ کی چیز اور نیند کو آرام کی چیز اور دن کو دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونے کا ذریعہ بنایا ہے۔

ایک تو یہ بتایا گیا کہ رات ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے اور تاریکی میں بہت سی اشیاء چھپ جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نیند سراپا تازگی کا باعث ہے کہ لوگ جب نیند پوری کر کے اُٹھتے ہیں تو بالعموم بہت تازہ دم اور مستعد ہوتے ہیں[2]۔ اور تیسرے، دن کا بتایا گیا ہے کہ اس میں گویا کہ دوبارہ زندگی مل جاتی ہے اور نقل وحرکت شروع ہوجاتی ہے۔ رات کا تعلق سکون کے ساتھ اور دن کا تعلق حرکت کے ساتھ، بتایا گیا ہے۔

---

[1] وأفيضوا فعل أمر والواو فاعل، وعلينا جار ومجرور متعلقان بأفيضوا، ومن الماء جار ومجرور متعلقان: بأفيضوا أيضا، لأن معنى الا فاضة هنا متضمن معني الالقاء، وأو حرف عطف، ومما جار ومجرور متعلقان بمحذوف معطوف من الماء، ولا بد من تقدير فعل، أي:وأطعمونا، علي حد قولهم :(علفتها تبناً وماءً بارداً) اعراب القرآن للد رويش، سورة الاعراف، ج:٣، ص: ٦٢.

[2] بالعموم اس لیے کہا گیا کہ بعض افراد کے ساتھ ان شہروں میں یہ مسئلہ ہوتا ہے، جو شہر کسی ساحل سمندر کے کنارے ہوتے ہیں کہ جب ان میں رات کو سوکر صبح اُٹھتے ہیں تو تازگی اور فرحت کا احساس نہیں پاتے۔

اب ایک دوسری آیت کریمہ پر غور فرمائیے:

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ. (پ:۷، س:الانعام، آیت:۱۳).	اور اُسی کی ہے سب (مخلوق) جو بھی رات کو ٹھہر جاتی ہے اور دن کو.

اب یہاں پر اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بلاشبہ سب مخلوق جو رات کو آرام کرتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی ہے لیکن یہ جو فرمایا ہے "دن کو" تو اس سے کیا مراد ہے؟ مخلوق بالعموم دن کو ساکن ہونے کی بجائے متحرک ہوتی ہے. سکون رات کو ملتا ہے اور حرکت دن کو ہوتی ہے اس لیے "دن کو" سے مراد کیا ہوگی؟

مفسرین کرام رحمہم اللہ میں سے بعض حضرات نے اس مقام پر اسی قانون کا استعمال کیا ہے.

علفتها تبناً وماءً بارداً	میں نے اُسے چارا کھلایا اور ٹھنڈا پانی.

اور اس قاعدے اور قانون کی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ کو زیادہ صحیح طور پر سمجھنے اور زیادہ صحیح ترجمہ کرنے کے لیے، اس میں آنے والے لفظ "النهار" سے پہلے ایک فعل کا اضافہ کرنا پڑے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ اس طرح ارشاد فرما رہے ہیں:

ولـه مـا سـكـن فـي الليل وما تحرّك في النهار.	اور اسی کی ہے سب مخلوق جو رات کو ٹھہر جاتی ہے اور دن کو حرکت کرتی ہے.

علامہ سمین حلبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر الدر المصون میں بعض اہل علم کا یہ قول تحریر فرماتے ہیں کہ:[1]

فمنهم من قال: لابد من محذوفٍ لفهم المعني، وقدّر ذلك المحذوف معطوفاً فقال: تقديره: وله ما سكن وما تحرّك. ﴿الانعام، رقم:۱۳، ج:٤، ص:٥٥٣﴾.	اس آیت کریمہ کے معانی سمجھنے کے لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں پر ایک فعل غائب ہے، جس کا ہونا ضروری ہے اور جب اس فعل کو لائیں گے تو اس طرح سے کہا جائے گا کہ اُسی (اللہ تعالیٰ) کی ہے ساری مخلوق جو کہ (رات کو) سکون پذیر ہوتی ہے اور (دن کو) متحرک ہوتی ہے.

علامہ ابوحیان اندلسی نے اپنی تفسیر "البحر المحیط" میں اسی آیت کے ضمن میں اس رائے کا ذکر کیا ہے.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا قرینہ[1]

1

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جا بجا حضرت رسالت مآب ﷺ کا ادب اور احترام سکھایا ہے۔ یہ تلقین کی ہے کہ انہیں عام انسانوں پر قیاس نہ کیا جائے، اُن کے حکم کے مقابلے میں کوئی حکم نہ دیا جائے، اُن کا نام لے کر چلایا نہ جائے اور اُن کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کیا جائے۔

حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تو اتنی احتیاط برتنے کا حکم دیتے ہیں کہ جس طرح اُن کی حیات طیبہ میں اُن

---

[1] لغت میں "قرینہ"، قربت، باہمی تعلق، ڈھنگ، علامت اور طریقے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم اپنے مجموعۂ کلام "بانگ درا" کے حصۂ غزلیات غزل (9) میں فرماتے ہیں۔

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

مراد یہ ہے کہ محبت میں جفا اور بے تابی کو برداشت کرنا چاہیے۔ ایسے نہیں ہونا چاہیے کہ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور بر سر محفل چلانے کی نوبت آجائے کیونکہ چلانا آدابِ محبت کے منافی ہے۔ محبت کے آداب میں، پہلا ادب یہ ہے کہ صبر و ضبط ہونا چاہیے۔ سو یہاں پر عنوان "قرینہ" ادب کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اسے علامہ مرحوم..........

کی مجلس میں آواز بلند کرنا ممنوع تھا ایسے ہی اب بھی یہی حکم اُن کے روضۂ مطہرہ کا ہے، کہ وہاں بھی آواز بلند کرنا جائز نہیں۔ فتویٰ اور مسئلہ یہی ہے کہ جیسے ان کی حیاتِ طیبہ میں اُن کا ادب اور احترام ضروری ہے، اب بھی ویسے ہی اُن کا ادب اور احترام لازم ہے۔

اُن کی زندگی میں اُن کی مجلس اور اُن کی گفتگو لائقِ تکریم تھی اور اب اُن کی قبر اطہر اور اُن کی احادیثِ طیبہ لائقِ تعظیم ہیں۔

اس کائنات کے ہر ذی شعور فرد کو اُن کا ادب سکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ.

(پ:۲۶، س : الحجرٰت، آیت: ۲)

اے ایمان والو! تم اپنی آوازوں کو حضرت رسالت مآب ﷺ کی آواز سے اونچا نہ کرو اور جب تم ان سے بات کرو تو ایسے زور سے مت بولو جیسے کہ تم ایک دوسرے سے بلند آواز میں بات کرتے ہو کہ کہیں تمہارے اعمال غارت ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔

آگے چل کر مزید ارشاد ہوا:

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ.

(پ:۲۶، س : الحجرٰت، آیت: ٤)

جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

بظاہر یہ حکم مسلمانوں کو دیا گیا کہ اپنی آواز کو پست رکھیں لیکن درحقیقت یہ حکم ہر فرد کے لیے ہے، خواہ وہ مسلم ہو کہ غیر مسلم، کیونکہ جن غیر مسلموں نے حضرت رسالت مآب ﷺ کا ادب واحترام کیا یقیناً وہ

..........کے اسی شعر سے مستعار لیا گیا۔ مزید تفصیلات وحوالہ جات کے لیے ملاحظہ ہو۔ (1) اردو لغت، قرینہ، ج:۴، ص:۲۳۶ مطبوعہ اردو لغت بورڈ کراچی۔ (2) کلیاتِ اقبال، ص:۱۸۰۔

اُن غیر مسلموں کے برابر نہیں تھے، جنھوں نے آپ کی بے ادبی کی. اللہ تعالیٰ کے ہاں دونوں کا مرتبہ یکساں نہیں.

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ ادب واحترام اسلام کی فروعات میں سے ہے اور غیر مسلم کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اسلام کی فروعات پر بھی عمل کرے بلکہ اس کے لیے تو پہلے یہ ضروری ہے کہ اصولِ اسلام توحید، رسالت، آخرت وغیرہ کو قبول کرے تو ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جائے گا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا ادب ایمان ہی کا ایک حصہ اور اس کی بنیاد ہے، جب اُس نے رسالت کا اقرار کیا تو وہ اقرار ادب واحترام کے ساتھ ہی قائم ہوا تھا اور اگر ادب جاتا رہا تو وہ اقرار بھی خود بخود رخصت ہو گیا.

آیت کریمہ کا آغاز جو اہل ایمان کے تذکرے سے ہوا تو اس کی وجہ وہ حالات تھے جن میں یہ وحی نازل ہوئی.

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ:

(1) ۹ھ میں بنو تمیم کا ایک قافلہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کسی شخص کو ہمارا امیر مقرر فرما دیں. قبل اس کے کہ آپ کسی کا انتخاب فرماتے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے متعلق رائے دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دوسرے شخص کے متعلق رائے دی کہ اسے امیر مقرر فرما دیں. اس مشورے اور بحث میں ان حضرات کی آوازیں کچھ بلند ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرما دی. گویا کہ دونوں حضرات پر عتاب فرمایا گیا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی موجودگی میں بلند آواز سے بات کرنا مناسب نہیں.

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعے میں بلند آواز سے بولنے پر یہ دونوں حضرات کیا گنہگار ہو گئے تھے؟

جواب یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بتقاضائے بشریت کوئی غلطی ہوئی بھی ہے تو اس کے بارے میں ایک تو یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ ان حضرات کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فیصلے کے طور پر ارشاد فرما دیا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ.

(پ: ۱۰، س: الانفال، آیت: ۷٤)

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے ہجرت کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا ہے، پھر وہ لوگ جنہوں نے انہیں (مدینہ طیبہ میں) آباد کیا ہے اور ان کی مدد کی ہے. یہ سب (دونوں گروہ، مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم) پکے اور کھرے مومن ہیں. ان سب کے لیے غلطیوں سے بخشش اور عزت کے ساتھ رزق ہے.

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ.

(پ: ۳۰، س: البینۃ، آیت: ۸)

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور یہ اللہ تعالیٰ سے خوش ہوں گے.

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی غلطیوں کو بخش دیا ہے. اس لیے اب کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کی کسی لغزش پر اعتراض کرے. وہ ایسی پاک جماعت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت رسالت مآب ﷺ کی صحبت کے لیے چن لیا تھا اور قیامت تک آنے والی تمام اُمتوں اور افراد کی ہدایت اُن کی اتباع سے وابستہ کردی تھی.

دوسری اصولی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت رسالت مآب ﷺ کو قرآن کریم میں دو مرتبہ یہ حکم دیا کہ جب آپ کے اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو آپ اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی درخواست کیا کیجیے. لغزش تو ہو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اور ان کے لیے استغفار کریں حضرت رسالت مآب ﷺ. کیا ٹھکانہ ہے ان حضرات کی عظمت و قرب خداوندی کا. سورۂ ال عمران میں ارشاد ہوا:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ.

(پ: ٤، آیت: ۱۵۹)

سو آپ انہیں معاف فرما دیجیے اور اُن کی بخشش کی دعا مانگیے.

سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ارشاد ہوا:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ. (پ:٢٦، آیت: ١٩)

اور آپ اپنی لغزشوں کی اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کی غلطیوں کی بخشش کی دعا مانگتے رہیے.

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن حضرات کی غلطیوں کی معافی کی درخواست حضرت رسالت مآب ﷺ پیش کرتے رہتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرما کر ان حضرات سے درگذر فرماتا رہتا تھا.تو جب اصل صورت حال یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہو اور ان کی غلطیوں پر گرفت کے بجائے درگذر فرما چکا ہو، تو اب کسی کا کیا حق باقی رہ جاتا ہے کہ ان حضراتِ مقربینِ بارگاہ پر خطا کار ہونے کا فتویٰ لگائے.

تیسری اصولی بات یہ ہے کہ جب یہ آوازیں بلند کرنے کا واقعہ ۹ھ میں پیش آیا تو آیات تو اس وقت نازل ہوئیں.اب اس حکم کے نزول کے بعد ایسی کوئی بات پیش آتی تو اس حرکت کے مرتکب گنہگار قرار پاتے.جب کوئی حکم نازل ہی نہیں ہوا تھا تو پھر اس کی خلاف ورزی کیسی اور قانون کے توڑنے کا جرم کیسا؟اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب تک شراب کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، پینے والے گنہگار تھوڑا ہی تھے.گناہ کا ارتکاب تو اس وقت مانا جائے گا جب شراب کے حرام ہونے کا حکم نازل ہو چکا تھا اور پھر اس کی خلاف ورزی کی گئی ہو.

آوازوں کے بلند نہ کرنے کے حکم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس قرآنی حکم کی ایسی اطاعت کی اور اپنی آواز کو حضرت رسالت مآب ﷺ کے سامنے اتنا پست کر دیا کہ جیسے کسی سے سرگوشی کرنے میں آواز کو دھیما رکھا جاتا ہے اور حتی کہ خود بنفسِ نفیس عرض کیا:[1]

يا رسول الله، والله لا أكلمك إلا

اللہ کے رسول اللہ تعالیٰ کی قسم آئندہ میں تو آپ سے

[1] تفسیر ابن کثیر، سورة الحجرات، آیت: ٣.١، ج: ٥، ص: ٦٤٤.

كأخي السّرار. — ایسے بات عرض کیا کروں گا جیسے کہ چھوٹا بھائی رازداری سے کوئی بات کیا کرتا ہے۔

اور حضرت عمر کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم فرماتے تھے:[1]

فما كان عمر يسمع رسول الله ﷺ بعدهذه الآية حتي يستفهمه. — عمر رضی اللہ عنہ اتنی آہستہ آواز میں کوئی بات عرض کرتے تھے کہ بعض مرتبہ حضرت رسالت مآب ﷺ دریافت فرماتے تھے کہ کیا بات کہی گئی ہے؟

یہ حکم تو ۹ھ میں نازل ہوا تھا[2] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی پہلے سے ہی یہ حالت تھی کہ گویا ہمیشہ سے حضرت رسالت مآب ﷺ کا ادب اور احترام ان کی فطرت میں سمو دیا گیا تھا صلح حدیبیہ کے دن بس ایک مرتبہ اس معاہدے پر حضرت رسالت مآب ﷺ سے باندازِ ناز کچھ عرض کرنے کی نوبت آ گئی تھی لیکن انہیں تمام عمر اس بات کا ملال رہا کہ حدیبیہ کے دن بھی آخر کیوں کر یہ جسارت ہوگئی فرماتے تھے:[3]

ما زلت أصوم وأتصدق وأصلي وأعتق من الذي صنعت يومئذٍ مخافة كلامي الذى تكلمته يومئذٍ حتى رجوت أن يكون خيرا. — میں نے اس حدیبیہ کے دن کی جرأت کے کفارے میں روزے رکھے ہیں، صدقہ کرتا ہوں نفوافل ادا کرتا رہا ہوں اور غلاموں کو آزاد کیا ہے کیونکہ اس دن حضرت رسالت مآب ﷺ سے کچھ نامناسب انداز سے بات کی تھی، اور اللہ تعالیٰ سے برابر ڈرتا

---

[1] صحيح بخاري، كتاب التفسير، سورة: الحجرت. باب لا ترفعوا أصواتكم فوق صوت النبي.

[2] في رواية أحمد "وفد بني تميم، وكان قدومهم سنة تسع بعد أن أوقع عيينة بن حصن بني العنبر وهم بطن من بني تميم". ذكر ذلك أبو الحسن المدائني. (فتح الباري، كتاب التفسير، باب لا ترفعوا أصواتكم فوق صوت النبي، ج: ٨، ص: ٥٩٠).

[3] البداية والنهاية، غزوة الحديبية، ج: ٤، ص:١٦٨.

رہا ہوں، یہاں تک کہ اب کچھ اطمینان ہے کہ اس
دن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے ہاں پوچھ نہیں ہوگی.

اس آیت کے نزول کے بعد حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے مجلس نبوی میں آنا چھوڑ دیا، اداس اور مغموم ہوئے اور سر جھکا کر اپنے گھر میں گوشہ نشینی اختیار کرلی. اُن کی آواز قدرتی طور پر بلند تھی اور اس وجہ سے ڈر گئے کہ مبادا اس حکم کی خلاف ورزی ہو جائے.[1] آخر کار ایک دن حضرت رسالت مآب ﷺ نے ان کی غیر موجودگی کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ عرض کیا گیا کہ وہ کہتے ہیں:

"میری آواز حضرت رسالت مآب ﷺ کی آواز سے بلند ہے اس لیے میرے اعمال برباد ہوگئے ہیں اور میں جہنم والوں میں سے ہوگیا ہوں".

---

[1] علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ مفتی بغداد اپنی تفسیر روح المعانی میں تحریر فرماتے ہیں:

وإنما كان الرفع منه طبيعة لما أنه كان في أذنه صمم وعادة كثير ممن به ذلك رفع الصوت.
(تفسير سورة الحجرات، آيت: ٢، ج: ٢٦، ص: ٤٠٤)

ان (ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ) کی آواز فطری طور پر بلند تھی اور اس لیے بھی کہ ان کو کچھ بہرے پن کا مرض بھی لاحق تھا اور جن کو یہ مرض ہوتا ہے، ان میں بہت سے لوگ بلند آواز سے گفتگو کیا کرتے ہیں

ایسے ہی قاضی ابوالسعود الحنفی رحمۃ اللہ علیہ بھی تحریر فرماتے ہیں:

وكان في أذنه وقر
(تفسير أبي السعود، سورة الحجرات، ج: ٦، ص: ١١٢)

انہیں اونچا سننے کی عادت تھی.

اور یہی بات امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۵۱۶ھ نے بھی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں سورۃ الحجرات کی تشریح میں تحریر فرمائی ہے.

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ میں اگر یہ ثقل سماعت تھا، تو کچھ عیب نہ تھا، لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ......

ارشاد ہوا:

...... کے حالات پر جتنا کچھ بھی لکھا گیا ہے، اس میں ان حضرات وخواتین کا ذکر بھی ملتا ہے، جو نابینا تھے اور ان کا بھی جنہیں کوئی دوسرا جسمانی عذر مثلاً جذام، گنگ اور لنگڑا پن وغیرہ لاحق تھا لیکن تلاش بسیار کے باوجود آج تک کسی ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بھی ایسا نہیں ملا جس میں یہ صراحت ہو کہ وہ بہرے تھے.

ایک روایت مجمع الزوائد میں ملتی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پوتے سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہم کے پاس سے بنوغفار قبیلے کے ایک بہت نورانی اور خوبصورت بوڑھے بزرگ صحابی رضی اللہ عنہ گذرے جو یا تو بہرے ہوتے تھے اور یا پھر وہ اونچا سنتے تھے.

(کتاب الصلاۃ ،باب فی السحاب و علامۃ المطر، رقم : ۳۲۹۸، ج: ۲، ص: ۴۰۹)

یہ صحابی رضی اللہ عنہ کون تھے؟ مکمل طور پر بہرے تھے یا صرف یہ کہ اونچا سنتے تھے؟ یہ بہرہ پن یا ثقل سماعت کب ہوا تھا؟ اسلام قبول کرنے سے پہلے یا بعد میں اور قبولیتِ اسلام میں یہ عذر بنا تھا یا نہیں وغیرہ، جب تک ان سوالات کا جواب نہ ملے ، یہ روایت مفید طلب نہیں کہ ایسے صحابی رضی اللہ عنہ کی تلاش ہے جو کم سے کم قبول اسلام کے وقت بہرے ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے بہرے شخص کو قبول اسلام کے لیے کیسے دعوت دی تھی.

اسی طرح کی ایک روایت مصنف عبدالرزاق میں بھی ہے کہ ایک صاحب نے تجارت کے معاملے میں کوئی مسئلہ دریافت فرمایا تھا لیکن وہ اونچا سنتے تھے اور حضرت رسالت مآب ﷺ نے انہیں مسئلے کا حل ارشاد فرما دیا تھا.

(ابواب القضاء ،باب الخلابۃ والموارۃ، رقم :۱۵۳۳۸، ج: ۸، ص: ۳۱۲)

لیکن یہ روایت بھی مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اترتی. اور کنز العمال میں بھی یہی روایت نقل کی گئی ہے. اس لیے جتنی بھی تحقیق کی توفیق ملی اس کے مطابق حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بہرہ نہیں تھا کیونکہ اگر کوئی بہرہ ہوتا تو وحی الٰہی اس تک کیسے پہنچتی ؟ اسلام کا ابتدائی دور تھا، اگر کوئی بہرہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوتا تو کسی نہ کسی روایت میں یہ تذکرہ ضرور ہوتا کہ اُسے اسلام کا پیغام کیسے دیا گیا تھا

بصرف مفتی بغداد علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ ہی یہاں پر تذکرہ فرما رہے ہیں کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ......

’’ثابت بن قیس کو بلاؤ اور انہیں یہ خوشخبری دو کہ وہ جنتی ہیں‘‘.

.... کو یہ عارضہ لاحق تھا. جتنے بھی تذکرہ نگاروں نے ان کا تذکرہ لکھا ہے تقریباً ہر ایک نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ یہ " جھیر الصوت " (بلند آواز والے) تھے اور اتنے زبردست مقرر تھے کہ جیسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حضرت رسالت مآب ﷺ کا شاعر کہا جاتا تھا تو انہیں حضرت رسالت مآب ﷺ کا خطیب مانا جاتا تھا مختلف قبائل کے افراد جب مدینہ طیبہ میں حاضر ہوتے اور اپنے خطباء کا تعارف، اور ان سے کوئی تقریر کرواتے تھے، تو ان سب کے مقابلے میں حضرت رسالت مآب ﷺ حکم دیتے کہ خطیب الانصار ثابت بن قیس تقریر کریں.

ایک اچھے خطیب اور مقرر کے لیے صرف زبان ہی سو فیصد عوارض سے پاک نہیں چاہیے بلکہ اس کی قوت سماعت بھی بالکل درست ہونی چاہیے وگرنہ وہ صحیح طور پر خطابت کا فریضہ انجام نہیں دے پائے گا.

اس لیے یہ تو مانا ہی نہیں جا سکتا کوئی خطیب اور وہ بھی حضرت رسالت مآب ﷺ کا خطیب الانصار بالکلیہ بہرا ہو. ہاں اگر ان میں سے کسی درجے میں معمولی سا بہرا پن تھا تو یہ وہ بات ہے جس کا تذکرہ اس مقام پر صاحب روح المعانی کر رہے ہیں لیکن اس کا بھی تو ثبوت چاہیے. جہاں تک ممکن تھا اسماء الرجال کی کتابوں کو کھنگالا گیا لیکن کسی نے بھی اس عارضے کا ذکر تک نہیں کیا. حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی جتنے بھی مراجع ہیں، اُن تمام مراجع میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ انہیں بہرے پن کا عارضہ لاحق تھا اس لیے اس کا ثبوت ضروری ہے یہ الگ بات ہے کہ اگر انہیں یہ عارضہ لاحق بھی ہوتا تو ہرگز کوئی عیب کی بات نہ تھی مزید تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف مراجعت کیجیے.

① معرفة الصحابة رضي الله عنهم لأبي نعيم الأصفهاني، باب الثاء، رقم: ٣٧٦، ج: ١، ص: ٤٢٤.

② معجم الصحابة رضي الله عنهم لأبي الحسن بن قانع البغدادی. محقق خليل ابراهيم قو تلاني، رقم: ١٣٠، ج: ٣، ص: ٩٤٥.

③ معجم مذکورہ ﴿2﴾ کا دوسرا نسخہ، تحقيق أبو عبدالرحمن صلاح المصراتي، باب الثاء، رقم: ١٣٠، ج: ١، ص: ١٢٦ . ...

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہم ثابت بن قیس کو اپنے درمیان چلتے پھرتے دیکھتے تھے اور ہم جانتے تھے کہ یہ جنتی ہیں. پھر جب (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتدین کے خلاف) جنگ یمامہ ہوئی تو دوران جہاد ایک مقام پر فوج کا پلڑا ہلکا تھا کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ اس حال میں تشریف لے آئے کہ انہوں نے خوشبو لگا رکھی تھی اور کفن پہن رکھا تھا فرمانے لگے مسلمانو! اپنے بعد برا نمونہ (بزدلی کا داغ) چھوڑ کر مت جاؤ اور پھر بہادری سے لڑے یہاں تک کہ شہید ہو گئے. سو یہ وہ لوگ تھے جو اس آیت کریمہ کے نزول سے پہلے بھی ادب کے پتلے تھے مگر اس حکم کے بعد تو وہ مزید محتاط ہو گئے تھے.

بہت سے مفسرین، محدثین اور مورخین کا خیال ہے کہ اس آیت کریمہ کا نزول ان لوگوں سے متعلق ہے، جن کا تعلق قبیلہ بنو تمیم سے تھا اور وہ 9ھ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تھے.

ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ بنو تمیم کے ستر یا اسی افراد مدینہ منورہ میں حضرت رسالت مآب ﷺ کے دولت کدے پر حاضر ہوئے اور تہذیب کے خلاف بلند آواز میں آپ کو، گھروں کے پیچھے سے پکارنا شروع کیا: "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر آؤ". اس شور پکار کو سن کر آپ تشریف لائے تو انہوں نے کہا.[1]

"یامحمد إن مدحنا زين وإن شتمنا شين نحن أكرم العرب"	اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارا، کسی کی تعریف کر دینا اس کا اعزاز ہے اور اگر ہم کسی کی مذمت کر دیں تو

.... ④ التاريخ الكبير للبخاري رحمة الله عليه، باب الثاء، رقم: ٢٠٨١، ج:٢، ص:١٦٧.

⑤ الاستيعاب لابن عبدالبر رحمة الله عليه، حرف الثاء، رقم: ٢٥٣، ج: ١، ص: ٢٧٦.

⑥ أسد الغابة لابن الاثير الجزري، باب الثاء والالف، رقم: ٥٦٩، ج:١، ص:٤٥١.

⑦ سير أعلام النبلاء، رقم: ٦١، ج:١، ص: ٣٠٨.

[1] روح المعاني، سورة: الحجرات، الآية:٤، ج: ٢٦، ص:٤٠٨.

یہ مذمت اس کے لیے داغ اور بدنامی ہے. عربوں

میں سب سے زیادہ قابل احترام ہم ہیں.

حضرت رسالت مآب ﷺ نے بردباری اور تحمل کا مظاہرہ کیا اور فرمایا یہ بات درست نہیں ہے بلکہ اعزاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی تعریف فرمادیں اور داغ یہ ہے کہ وہ کسی کی مذمت فرمادیں. رہ گے سب سے زیادہ قابل احترام تو وہ حضرت یوسف بن حضرت یعقوب بن حضرت اسحٰق بن حضرت ابراہیم علیہم الصلاۃ والسلام تھے.

بنو تمیم خاموش ہوگئے اور پھر انہوں نے اپنی قدیم قومی روایات کے مطابق ''تفاخر'' کی دعوت دی.[1]

حضرت رسالت مآب ﷺ نے اگرچہ یہ کہہ کر ''تفاخر'' سے انکار فرمادیا کہ ہم شعروشاعری کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے اور نہ ہی ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے پر فخر کا اظہار کریں لیکن جب آپ لوگ مقابلے کی دعوت دیتے ہیں تو اچھا پھر آغاز کیجیے.

ان کے شاعر زبرقان بن بدر نے اپنے قبیلے کو سب سے بہتر ثابت کرنے والے اشعار پڑھے اور اپنے کارنامے بیان کیے. پھر ان کے خطیب عطارد بن حاجب نے اپنے قبیلے کی مدح سرائی کی. حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے شاعر حضرت حسان بن ثابت اور اپنے خطیب حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان کا جواب دیا جائے.

اس تفاخر کا فیصلہ بنو تمیم ہی نے کرنا تھا کیونکہ چیلنج انہوں نے کیا تھا. اقرع بن حابس تمیمی اٹھے[2] اور فیصلہ

---

[1] عربوں کا صدیوں سے قومی دستور اور طریقہ یہ تھا کہ لڑائی یا کسی مقابلے کے موقع پر فریق ثانی کو اُبھارنے یا مقابلے کے لیے اُکسانے کی غرض سے، اپنے کارناموں اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے اپنے شاعر سے فخر یہ اشعار اور اپنے خطیب سے فخر و ناز پر مشتمل تقریر کروایا کرتے تھے. اس مقابلے کو تفاخر یا اپنی بڑائی کا اظہار کرنا یا باہم ایک دوسرے پر ایک دوسرے سے فخر کی بازی جیتنا کہلاتا تھا.

[2] اسد الغابہ میں ابن اثیر جزری نے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں ابن درید کے حوالے سے......

سنایا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا خطیب ہمارے خطیب سے اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے اچھا ہے۔ ان کے کارنامے ہمارے کاموں سے بلند تر اور ان کے حقیقت پر مبنی بلند آہنگ دعوے، ہمارے دعوؤں سے بڑھ کر ہیں اندازہ کرنا چاہیے کہ اگرچہ اس وقت بنوتمیم کے یہ حضرات غیر مسلم تھے مگر انصاف کے ترازو کو قائم رکھا اور اپنے شاعر اور خطیب کی بے جا طرف داری نہیں کی۔

لیکن انہی بنوتمیم نے اپنی آمد پر جس بے ادبی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ فعل قابلِ گرفت تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیات نازل فرمائیں اور تعلیم دی کہ:

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

ترجمہ: آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کے عرش سے زیادہ لائق احترام اور محتاط رہنے کا مقام حضرت رسالت مآب ﷺ کی مجلس اور ان کی آرام گاہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ادب کے مارے حضرت جنید و حضرت بایزید رحمہم اللہ جیسے اکابر اولیاء اللہ کا دم گھٹتا ہے کہ مجال ہے وہ اونچی آواز سے سانس بھی لے سکیں۔

ابن عطیہ اور بہت سے اہل علم کی رائے یہ ہے کہ یہ آیات بنوتمیم کے ان، ادب سے ناآشنا لوگوں کے[1] بارے میں ہی نازل ہوئی تھیں، جنہوں نے مدینہ طیبہ پہنچ کر کچھ زیادہ عقل سے کام نہیں لیا تھا اور چلا چلا کر حضرت رسالت مآب ﷺ کو پکار رہے تھے۔ اگر ان حضرات کی رائے کو تسلیم کر لیا جائے تو حضرت سیدنا ابوبکر اور حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی آپس میں تکرار اور آواز بلند ہو جانے کی روایات اور ان پر

.... ان کا اصل نام فراس بن حابس اور اقرع ان کا لقب بتایا ہے۔ یہ خراسان اور جوزجان کے معرکوں میں شریک رہے اور خلافتِ عثمانی میں انتقال ہوا۔

[1] قال ابن عطية الصحيح أن سبب نزول هذه الا ية كلام جفاة الاعراب. (فتح الباري، كتاب التفسير، سورة الحجرت، باب لا ترفعوا اصواتكم فوق صوت النبي، ج :٨، ص: ٥٩).

وارد ہونے والی مباحث کا ہی سرے سے خاتمہ ہو جاتا ہے۔

---

②

رفع صوت یا آواز بلند کرنا کبھی تو اس معنی میں آتا ہے کہ کہیں کوئی ظلم ہو، ناانصافی اور کسی کی حق تلفی ہو تو اس کے خلاف احتجاج کیا جائے۔

ع مزدور بلند کر رہے ہیں آواز
سرمائے کا ہو ختم، اجارہ جلدی

(رباعیت یکتا امروہی)

حضرت رسالت مآب ﷺ کے ہاں تو یہ ناقابل تصور ہے کہ انہوں نے کسی پر ظلم کیا ہو اور ظلم پر بطور احتجاج صدا بلند کی گئی ہو، وہاں تو رحمت اور عدل ہی تھا۔ پوری سیرتِ طیبہ میں ایک ادنیٰ سا واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کہیں ناانصافی روا رکھی گئی ہو۔ جس ہستی کا خشیت الہیہ سے یہ حال ہو کہ وفات سے چند دن پہلے اپنے آپ کو احتساب کے لیے مسجد نبوی میں عام مجمعے کے سامنے پیش کر دے، اس کے ہاں کسی کے حقوق کی کیا پامالی اور کیا جور و جفا۔

کبھی آواز بلند کرنا کسی شخص کے استہزاء و تضحیک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ کفار و منافقین کا شیوہ تھا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جس نے بھی ایسے کیا یا کرے گا اس کا اسلام ہی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ یہ مسئلہ تو سب جانتے تھے اور ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا مذاق اڑانا یا ان کی توہین کرنا، کفر ہے۔

رفع صوت یا آواز بلند کرنے کے ایک معنی یہ بھی آتے ہیں کہ جیسے دوست و احباب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو بر بنائے بے تکلفی ایک دوسرے سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔

اٹھی یکبارگی آواز واں سے
نہایت آشنائی کی زبان سے

(مثنوی نل دمن)

اس آیت کریمہ میں درحقیقت اسی رفع صوت سے منع کیا گیا کہ کوئی شخص عام روزمرہ کی گفتگو میں بھی حضرت رسالت مآب ﷺ کی موجودگی میں اونچا نہ بولے. اُن کا ادب اس حد تک کرنا، ضروری ہے کیونکہ اگر آج ذراسی بے احتیاطی سے آواز بلند ہو جاتی ہے تو کل کو یہی بے احتیاطی کفر تک بھی پہنچا سکتی ہے. اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کا ایمان اور اپنے بھیجے ہوئے رسول حضرت رسالت مآب ﷺ کا ادب اس تک ملحوظ خاطر اور مطلوب ہے۔[1]

اور کبھی بوجہ ضرورت جو آپ کے سامنے آواز بلند کی گئی ہے. یا آپ نے خود کسی کو بلند آواز سے پکارنے کا حکم صادر فرمایا ہے یا جہاد میں کسی جنگی ضرورت کے تحت آواز بلند ہوئی ہے تو یہ تمام مواقع اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور ہرگز بے ادبی کے دائرے میں نہیں آتے. کیا آپ کی موجودگی میں اذان بلند آواز سے نہیں دی جاتی تھی؟ کیا بڑے مجمعے میں فرض نماز اور نماز عیدین میں تکبیرات کی آواز بلند نہ ہوتی ہوگی؟ کیا حج اور عمرہ میں تلبیہ اونچی آواز سے نہ پڑھا جاتا ہوگا؟ کیا زمانے بھر کے دکھیارے اور ستائے ہوئے مظلوم، ظالموں کے خلاف، آپ کے سامنے باواز بلند فریاد نہیں کرتے تھے؟ یقیناً ایسے ہی ہوتا تھا لیکن ان باتوں میں بے ادبی کا دور دور تک کا شائبہ بھی نہیں ہے.

---

[1] وليس المراد بما نهي عنه من الرفع والجهر ما يقارنه الاستخفاف والاستهانة فان ذلك كفر بل ما يتوهم أن يودي اليه مما يجري بينهم أثناء المحاورة من الرفع والجهر حسبما يعرب عنه قوله تعالى:﴿كجهر بعضكم لبعض﴾ خلا أن رفع الصوت فوق صوته عليه الصلاة والسلام لما كان منكرا محضاً لم يقيد بشيء ولاما يقع منهما في حرب أو مجادلة معاند أوإرهاب عدو أو نحو ذلك.(تفسير أبي السعود، سورة الحجرات ، الآيات، ١-١٨، ج: ٦،ص : ١١٢)

غزوۂ حنین میں ایک موقع پر آپ نے اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو ادھر بلائیں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو پوری شدت سے پکارا۔ اور وہ اپنی بلند آواز کے لیے پہلے ہی مشہور تھے۔ حتیٰ کہ لکھا گیا ہے کہ ایک مرتبہ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی مدد کے لیے لوگوں کو پکارا اور اس پکار کی آواز ایسی بلند تھی کہ آواز کی شدت و گھبراہٹ سے حمل گر گئے۔ [1]

---

③

سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ بلند آواز سے نہ بولنے کا حکم کب تک کے لیے ہے؟ کسی بھی حکم کی مدت کبھی عارضی ہوتی ہے اور کبھی دائمی۔ ہر ملک کی عدلیہ یہ تعین کرتی ہے کہ یہ حکم ملک میں کب تک چلے گا؟ کس علاقے میں یہ حکم کب تک کے لیے نافذ العمل ہے؟ اور اس حکم کا تعلق مختلف افراد سے کتنے عرصے کے لیے ہے؟

فقہ اور اسلام کے قوانین و احکامات بھی اسی طرح کی مباحث سے پُر ہیں اس لیے ایک دلچسپ بحث یہ بھی ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے سامنے آواز بلند نہ کرنے کا حکم کب تک کے لیے ہے؟

ظاہری طور پر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ حکم صرف حضرت رسالت مآب ﷺ کی حیاتِ طیبہ تک ہی تھا۔ اور جب وہ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اب وہ ہستی ہی نہیں رہی جس کا یہ ادب ملحوظ خاطر رکھنا تھا اور اس

---

[1] ففي الحديث أنه عليه الصلاة والسلام قال للعباس بن عبدالمطلب لما ولي المسلمون يوم حنين: نادِ أصحاب السمرة فنادي بأعلي صوته أين أصحاب السمرة و كان رجل صيتاً. يروي أن غارة أتتهم يوماً فصاح العباس، يا صباحاه! فأسقطت الحوامل لشدة صوته. (روح المعاني ، سورة الحجرات، الآية: ٢، ج:٢٦، ص: ٤٠٣).

حکم کے مصداق اور اس کی اتباع کرنے والے صرف حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی تھے، جنہوں نے اس حکم پر عمل کرنا تھا پھر وہ بھی نہیں رہے اور اس حکم کی مدت بھی ختم ہوگئی کیونکہ اس حکم کا محور و مرکز سید الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی. اور اتباع کرنے والے صرف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور اب بھی جنت میں جا کر بس گئے.

پڑھنے والوں میں سے شاید بعض کو تعجب ہو کہ اہل علم نے اس ظاہری طور پر سمجھ آنے والے نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا. وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے. حضرت رسالت مآب ﷺ کا جو ادب و احترام اور ان کی محفل میں آواز بلند نہ کرنے کا حکم ان کی موجودگی میں تھا، آج یہی حکم ان کے روضۂ طیبہ کے لیے بھی ہے.

علامہ سید محمود آلوسی مفتی بغداد رحمۃ اللہ علیہ فتوی تحریر فرماتے ہیں:[1]

واستدل العلماء بالآية على المنع من رفع الصوت عند قبره الشريف ﷺ، وعند قراءة حديثه عليه الصلاة والسلام لأن حرمته ميتاً كحرمته حياً.

اور علماء نے اس آیت کریمہ سے یہ دلیل لی ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی قبر مبارک کے سامنے بھی اونچی آواز سے بولنا منع ہے. اور ایسے ہی جب حدیث شریف پڑھی جا رہی ہو، تو اونچی آواز سے نہیں بولنا چاہیے کیونکہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی عزت و حرمت جیسے اُن کی حیاتِ طیبہ میں کرنی فرض تھی ایسے ہی آج بھی اُن کا احترام بجالانا ضروری ہے.

حضرت رسالت مآب ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بعد اب بھی دو مقامات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اُن کے حقوق کے باب میں اب بھی ایک مقام پر اور ایک موقع پر آواز بلند نہ کرنے کا حکم نہ صرف یہ کہ

---

[1] سورة الحجرات، الآية :٢، ج :٢٦، ص:٤٠٤.

جاری ہے بلکہ قیامت تک جاری رہے گا.

(1) مقام تو واضح ہوا— قبر مبارک — ذرا غور کرنا چاہیے کہ کیوں؟ قبر مبارک میں ایسی کیا خاصیت ہے کہ وہاں پر آواز بلند نہ کی جائے. جن حضرات کا خیال یہ ہے کہ اس قبر اطہر میں جو محفوظ جسدِ اطہر ہے وہ اب تک ایسے تر و تازہ ہے جیسے تازہ کھلا ہوا گلاب کا پھول اور اسی طرح محفوظ ہے، جیسے روز اوّل میں اسے رکھا گیا تھا لیکن جو صلاۃ وسلام وہاں پر پیش کیا جاتا ہے، وہ جسم اسے بالکل نہیں سنتا. کوئی آواز اس تک نہیں پہنچتی اور وہ کسی سلام کا بھی جواب عنایت نہیں فرماتے تو وہ حضرات غور کریں کہ پھر اس جسم یا مقام میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ وہاں پر آواز بلند نہ کی جائے؟ جب وہ سنتے ہی نہیں ہیں تو پھر اُن کی قبر مبارک پر اونچا بولنا یا آہستہ بولنا، سب برابر ہے. پھر کس کا ادب کیا جائے اور اونچی آواز پر پابندی کیوں ہو؟

اگر یہ کہیں کہ مسجد کا احترام کرنا ہے اس لیے اونچا بولنا منع قرار دیا گیا تو عبارت دیکھ لینی چاہیے ذکر قبر اطہر کے ادب کا کیا گیا ہے، مسجد کا نہیں.

(2) موقع —تو وہ ہے جب حدیثِ نبوی کا درس ہو رہا ہو. علم حدیث کی تعلیم و تعلم جاری ہو، اس موقع پر بھی آواز بلند کرنا منع ہے. کیوں؟ اس لیے کہ ارشادات و فرامینِ نبوی علیہ الصلاۃ والسلام کی قرأت ہو رہی ہے. اس کلام کی بھی عزت و حرمت ہے. اور قیامت تک یہ عزت و حرمت باقی ہے. اگر کوئی شخص یہ ثابت کرنا چاہے کہ یہ احترام اس لیے ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ ہمیشہ وہاں تشریف فرما ہوتے ہیں، تو یہ وہ نظریہ ہے جو حد سے بڑھی ہوئی عقیدت اور ایسا غلو ہے کہ اس کے ڈانڈے صفاتِ باری تعالیٰ سے جا ملتے ہیں یہ نظریہ جہلاء کا تو ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جنہیں علم، تقوی اور شعور کی دولت سے نوازا ہے، وہ اس گمراہی سے کوسوں دور ہیں آج جو افراد بھی اُمت میں، تعلیم حدیث کے رفیع منصب پر

فائز ہیں انہیں بھی غور کر لینا چاہیے کہ جب حدیث شریف کی تعلیم ہو رہی ہو، عبارت پڑھی جا رہی ہو، درسِ حدیث ہو رہا ہو تو اس موقع پر ادب کیا ہے۔ اس موقع پر طلباء سے باتیں کرنا، مہمانوں کی آمد و رفت پر توجہ زیادہ اور حدیث پاک سے بے توجہی اور دوستوں سے گپ شپ، موبائل فون پر مسلسل گفتگو یہ سب کچھ اس مقام کے نامناسب اور اس علم کی بے ادبی نہیں تو اور کیا ہے۔

الامام الحافظ ابو الفداء اسمٰعیل بن کثیر الدمشقی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر، حدیث اور تاریخ میں درجۂ امامت پر فائز ہیں۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:[1]

وقال العلماء يكره رفع الصوت عند قبره، كما كان يكره في حياته، لأنه محترم حياً وفي قبره صلوات الله وسلامه عليه دائماً.

علماء کرام (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی قبر اطہر کے سامنے بلند آواز سے بولنا ایسے ہی منع ہے جیسے کہ خود اُن کی حیاتِ طیبہ میں منع تھا اس لیے کہ اُن کا بہت زیادہ احترام ہے۔ وہ زندہ ہیں۔ اور اُن کی قبر میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور سلامتی ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے تو معاملہ بالکل صاف کر دیا کہ روضۂ اطہر کے سامنے آواز اس لیے بلند نہیں کی جا سکتی کہ حضرت رسالت مآب ﷺ اپنی قبر طیبہ میں حیات ہیں۔ اہل السنۃ والجماعت کا یہی عقیدہ ہمیشہ رہا ہے اور وہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے احترام میں حد سے کم اور حد سے زیادہ، دونوں انتہاؤں سے دور، ہمیشہ اعتدال میں رہے ہیں۔ اُنہیں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا بندہ، اس کی مخلوق اور اس کا آخری پیغمبر جان کر برابر ان کی تعظیم بھی کرتے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ انہی کو بزرگ و برتر مانتے رہے ہیں۔ فصلوات الله تعالىٰ الرحمن الودود ذي الجلال والإكرام

[1] تفسیر ابن کثیر، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ١-٣، ج: ٥، ص: ٦٤٦۔

والملائکة المقربین والنبین والصدیقین والشہداء والصالحین وماحمد وسبح لك من شیئ یا رب العلمین علی سیدنا ومولانامحمد بن عبداللّٰہ خاتم النبیین وامام المتقین والسلام.

" الجامع لاحکام القرآن " میں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ بھی "قبر اطہر" کے احترام میں لکھتے ہیں:[1]

وقد کرہ بعض العلماء رفع الصوت عندقبرہ علیہ السلام.

اور بعض علماء نے (اس آیت سے یہ دلیل لی ہے اور) کہا ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی قبر مبارک کے سامنے چلانا جائز نہیں ہے.

قاضی ابوبکر ابن العربی ناصبی (جو کہ عموماً بے ادب ہوتے ہیں) ہونے کے باوجود اس مقام پر ادب کا دامن تھامے رہے ہیں. "آواز بلند کرنے کے مسئلے میں لکھتے ہیں:[2]

حضرت رسالت مآب ﷺ کا ادب جیسے کہ ان زندگی میں کیا جاتا تھا، اب وفات کے بعد ایسے ہی کیا جائے گا اپنی عظمت کے اعتبار سے ان کی احادیث اب بھی ویسے ہی قابل احترام ہیں جیسے کہ آپ اپنے زندگی میں جو کلام فرماتے تھے اور وہ احترام سے سنا جاتا تھا سو اب بھی یہ حکم ہے کہ جب اُن کی احادیث

---

[1] الجامع لأحکام القران، سورة الحجرات،ج: ١٦، ص:٣٠٧.

[2] حرمة النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم میتا کحرمته حیاً، و کلامه المأ ثور بعد موته في الرفعة مثل کلامه المسموع من لفظه، فاذا قرئ کلامه وجب علی کل حاضر ألا یرفع صوته علیه، ولا یعرض عنه، کما کان یلزمه ذلك في مجلسه عند تلفظه به، وقد نبه اللّٰہ تعالیٰ علی دوام الحرمة المذکورة علی مرور الأزمنة بقوله تعالیٰ:﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾. وکلام النبي ﷺ من الوحي وله من الحرمة مثل ما للقرآن إلا معاني مستثناة بیانها في کتب الفقه. (احکام القرآن لابن العربي، سورة الحجرات، الآیة:٢، ج: ٤، ص: ١٠٧).

پڑھی جائیں تو جو بھی اس مجلس میں موجود ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی آواز بلند نہ کرے، اوراس مبارک کلام کو سننے سے کسی قسم کی بیزاری میں مبتلا نہ ہو، ایسے (شوق ومحبت سے) سنے جیسے کہ گویا اُن کی مجلس میں موجود ہے اور وہ بنفسِ نفیس جو کچھ ارشاد فرما رہے ہیں اور ہر دور میں اس احترام کو باقی رکھنا ضروری ہے. اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾. (پ:۹، س: الاعراف، الآیة: ۲۰٤). "اور جب قرآن کریم کی تلاوت کی جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے". (جب وحی کے لیے خاموشی سے سننے کا حکم ہے) تو دیکھیے حضرت رسالت مآب ﷺ کا کلام (حدیث) بھی وحی ہی ہے. اس کی عزت واحترام بھی ویسے ہی ہے جیسے کہ قرآن حکیم کی عزت واحترام ہے. ہاں کتاب وسنت میں فقہ کے اعتبار سے جو فرق ہے وہ فقہ کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے.

اس تمام بحث کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچنا چاہیے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی موجودگی میں اپنی آواز اُن کی آواز سے بلند نہ کرنے کا حکم دائمی اور ابدی ہے. حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس حکم پر عمل کرتے تھے. اور مجلس میں بہت دھیمی اور آہستہ آواز سے گفتگو کرتے تھے اور اب اُمت کو چاہیے کہ جب بھی روضۂ انور پر حاضری ہو تو ضروری ہے کہ مسجد نبوی میں بغیر ضرورت کے گفتگو ہی نہ ہو اور اگر بامر مجبوری کوئی بات کہنی پڑ جائے تو کوشش کی جائے کہ آواز دھیمی رکھی جائے اور بالکل بلند نہ ہو، ایسے نہ ہو کہ بے ادبی ہو جائے اور "نیکی برباد گناہ لازم" کی صورت حال بن جائے. اپنی حیاتِ طیبہ میں وہ لوگوں کے سامنے زندہ تھے اور زندہ اب بھی ہیں لیکن لوگوں کی نگاہوں سے مستور اور اپنی قبر مبارک میں، اور اس حکم کو اب قیامت تک کوئی منسوخ نہیں کرسکتا.

4

آخر سے پہلے کی ایک بحث یہ رہ گئی کہ ”آواز بلند نہ کرنا“ یہ حکم خاص ہے کہ عام؟ کیا صرف حضرت رسالت مآب ﷺ کا مقام ایسا تھا کہ اُن کے سامنے آواز بلند نہ کی جائے یا آپ کے بعد بھی حسب مراتب، کسی کو یہ مقام ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ جیسے حضرات صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے یہ ضروری تھا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے سامنے آواز بلند نہ کریں ایسے ہی ادب کا تقاضا ہر چھوٹے کے لیے یہی ہے کہ جو شخص بھی عمر، مرتبے، عہدے اور علم میں اُس سے بلند تر ہو اُس کے سامنے آواز بلند نہ کرے، بچوں کے لیے ادب یہ ہے کہ بڑوں کے سامنے آواز بلند نہ کریں. اولاد والدین کے سامنے نہ چلائے ماتحت اپنے امیر کے سامنے تمیز سے بات کرے. سائل علماء کے سامنے اور مرید اپنے پیر و مرشد کے سامنے اونچی آواز سے مت بولے. ظلم اس حکم سے مستثنیٰ ہے. بڑے جب ظلم کریں گے تو اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی جائے گی. لیکن پہلے یہ بھی تو ثابت کرنا ہوگا کہ جسے چھوٹے ظلم سمجھ رہے ہیں وہ حقیقتاً اور شرعاً ظلم ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ظلم ثابت ہو جائے اور چھوٹے احتجاج کریں، اس میں آواز بلند ہو جائے تو قابل معافی ہے. حکمران ہوش کے ناخن لیں. اپنے منصب کا احترام خود سیکھیں تا کہ اُن کے خلاف آواز بلند نہ کی جائے اور اگر اُن کے احکامات مبنی بر ظلم ہوں تو کلمہ حق بلند کیا جائے گا ظلم کے خلاف بولا جائے گا اور ریاستی جبر و ظلم کے خلاف قربانی بھی دی جائے گی.

لیکن جب ظلم نہ ہو تو اُس کے علاوہ عمومی معاشرتی زندگی میں اولاد اپنے والدین کے سامنے اور چھوٹے اپنے بڑوں کے سامنے زبان نہیں چلائیں گے. اختلاف رائے ایک فطری اور ناگزیر عمل ہے. کوئی اس سے منع نہیں کر سکتا. مکان کی تعمیر میں دروازے کی تنصیب پر بھائی اور بھائی کا اختلاف ہو سکتا ہے. والد اور بیٹے میں اختلاف ہو سکتا ہے. ملکی اور قومی سطح پر ایک نسل سے دوسری نسل کو اختلاف ہو سکتا ہے. مثبت

اختلاف رائے ایک صحت مند معاشرے کی دلیل ہے لیکن اختلاف رائے کے اظہار کے لیے چلا کر بولنا ہی کیوں ضروری ہے؟ آواز کو بلند کر کے دوسرے کی توہین کرنا یہ کون سی تہذیب ہے؟ اسلام اختلاف رائے کا پرزور حامی اور اس کا خواہاں ہے لیکن حکم دیتا ہے کہ اس اختلاف کو تہذیب کے دائرے ہی میں رہنا چاہیے. جس سے اختلاف رائے ہے، اُس کی عمر، اُس کے رتبے، اُس کے عہدے، اُس کے علم اور اُس کے مقام کو بہر حال ملحوظ خاطر رکھا جائے گا اور جو فرد اور قوم اختلاف اور احترام کو جمع نہیں کر سکتے، انہیں چاہیے کہ وہ سمجھیں کہ ابھی وہ خود تربیت کے محتاج ہیں. وہ دین و دنیا کہیں پر بھی نہیں کھپ سکتے، اور وہ اس طرز عمل سے اپنے لیے ایسا گڑھا کھود رہے ہیں کہ دنیا میں ترقی سے اور آخرت میں برکتوں سے محروم ہو جائیں گے. آواز بلند نہ کرنے کا حکم دائمی و ابدی ہے. وقت، مقام اور شخصیت تینوں کے اعتبار سے لاگو ہوتا رہے گا.

علامہ ابو حیان اندلسی رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:[1]

و کرہ العلماء رفع الصوت عند قبر رسول اللہ ﷺ وبحضرۃ العالم، وفی المساجد.	حضرت رسالت مآب ﷺ کے روضۂ مطہرہ کے سامنے، کسی عالم دین کی موجودگی میں اور مسجدوں میں آواز بلند کرنے کو علماء نے مکروہ قرار دیا ہے.

غور فرما لیجیے، مساجد میں آواز بلند کرنا بھی مکروہ ہے. وہاں آواز بلند کرنے اور غل غپاڑہ مچانے کے لیے کوئی فاسق و فاجر، گنہگار، اور شرابی نہیں آتا، اِس دور میں مساجد میں ہنگامے بالعموم وہی لوگ کر رہے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو دین کا سب سے بڑا خیر خواہ اور محراب و منبر کا حقیقی وارث سمجھتے ہیں.

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں تحریر فرماتے ہیں:[2]

و کرہ بعض العلماء رفع الصوت فی	اور بعض علماء نے علماء کرام کی عزت واحترام کی وجہ

---

[1] البحر المحیط، سورۃ الحجرات، الآیات: ۱-۱۸، ج: ۹، ص: ۵۰۸.

[2] سورۃ الحجرات، ج: ۱۲، ص: ۳۰۷.

مجالس العلماء تشريفا لهم، اذ هم ورثة الأنبياء.

سے اُن کی مجلس میں آواز بلند کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ علماء حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے وارث اور جانشین ہوتے ہیں.

لیکن جب معاشرے میں جہلاء کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ اہل علم اپنے منصب و مرتبے کا خیال کرتے ہوئے ان کی طعنہ زنی اور توہین آمیز رویے سے بچنے کے خاطر تنہائی اختیار کرلیں تو وہاں ورثاء انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام تو کجا خود اگر بالفرض حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا اور معاشرے میں لوٹ آئیں تو ایسے حیوان نما انسانوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہوئے، واپس تشریف لے جائیں.

حجۃ الاسلام حافظ ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اتنی واضح عبارت لکھی ہے کہ کسی قسم کے کسی شبہے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی. تحریر فرماتے ہیں[1]:

> یہ آیات اگرچہ حقیقت میں تو اس لیے نازل ہوئی تھیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی تعظیم اور ان میں اور دوسرے تمام لوگوں کے احترام میں فرق کو واضح کیا جائے لیکن اس آیت میں ہمیں بھی یہ سکھایا گیا ہے کہ ہم اُن لوگوں کا برابر احترام کرتے رہیں جن کا احترام کرنا ہمارے لیے ضروری ہے. مثلاً والد کا احترام، عالم دین کا احترام، کسی عبادت گزار متقی شخص کا احترام، جو شخص دین کو نافذ کرتا ہے، اُس کا احترام، جو بھی شخص ہم سے عمر یا نیکی میں بڑھا ہوا

---

[1] وهذه الآيات وان كانت نازلة في تعظيم النبي ﷺ و إيجاب الفرق بينه وبين الأمة فيه فإنه تأديب لنا فيمن يلزمنا تعظيمه من والد وعالم وناسك وقائم بأمر الدين وذي سن وصلاح ونحو ذلك إذ تعظيمه بهذا الضرب من التعظيم في ترك الجهر دفع الصوت عليه وترك عليه والتمييز بينه وبين غيره ممن ليس في مثل حاله وفي النهي عن ندائه من وراء الباب والمخاطبة له بلفظ الأمرلأن الله قد ذم هؤلاء القوم بندائهم إياه من وراء الحجرة وبمخاطبته بلفظ الأمر في قولهم أخرج الينا . (احكام القرآن، سورة الحجرات ، ج:٥، ص:٢٧٧).

ہے، اُس کا احترام، اِن تمام لوگوں کا اور اسی طرح کے دوسرے حضرات کا بھی ادب اور احترام واجب ہے .اور اِن کی تعظیم اور احترام یہ ہے کہ ہم دوران گفتگو اپنی آواز کو اُن کی آواز سے بلند نہ کریں.اور اُن سے اِس انداز میں گفتگو نہ کی جائے، جیسے ہم اپنے ہم عمر لوگوں سے کرتے ہیں اور ایسے ہی اُن کی حیثیت اور مرتبے کو پہچان کر انہیں عام لوگوں پر ترجیح دی جائے.اُن کو بلانے اور مخاطب کرنے میں اُن کا نام نہ پکارا جائے اور اُن سے کوئی کام کہنا ہو تو اُنہیں کام کرنے کا حکم دینے کا لہجہ نہیں اختیار کرنا چاہیے.

اس ادب ہی کا رویہ تھا کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک بچے اپنی والدہ کا نام اور بیوی اپنے شوہر کا نام پکارنے سے گریز کیا کرتے تھے.اس معاشرے میں ان اداب کی تربیت دی جاتی تھی.

اب شوہر اپنے دوستوں کے سامنے بیوی کا نام لیتے ہوئے نہیں جھجکتا، کجا وہ ادب کہ بیوی شوہر کا نام بے تکلفی سے نہیں لیتی تھی .اب شوہر اور بیوی میں ادب کی نہیں دوستی کی نسبت ہے.اب وہ اس کے بچوں کی ماں، کم اور (Life Partner) زیادہ ہے.سو جب ایک نسل ہی ادب اور احترام کے تقاضے نہیں نبھائے گی تو اس کی آئندہ نسل سے ادب کی توقع رکھنا عبث ہے.

آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ خود حنفی فقیہ تھے زیر بحث مسئلہ اگرچہ فقہ سے زیادہ اخلاقیات سے متعلق ہے تاہم نیکی اور گناہ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو پھر تو جو بھی شخص اپنے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اُس کی آمد پر کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا جائے، تو کھڑا ہونا چاہیے.فتاوی شامی میں ہے:[1]

---

[1] قیام الجالس في المسجد لمن دخل علیه تعظیماً، وقیام قاريء القرآن لمن یجيء تعظیماً لایکره......

اگر کوئی شخص مسجد میں بیٹھا ہوا ہے یا کوئی شخص قرآن کریم کی تلاوت کر رہا ہے اور کوئی ایسی ہستی آ گئی جس کی تعظیم اور احترام ضروری ہے اور یہ دونوں اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے تو یہ مکروہ کام نہیں ہے. "مشکل الآثار" میں لکھا ہے کہ کسی کے آنے پر کھڑا ہونا بالکل ہی ناجائز نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص یہ پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے آجانے پر کھڑے ہو جایا کریں، تو پھر ایسے شخص کے لیے کھڑا ہونا مکروہ ہے. وگرنہ وہ آدمی جو یہ نہ چاہے کہ لوگ اس کے آنے پر کھڑے ہوں، ایسے شخص کی آمد پر قیام مکروہ نہیں ہے.

سو یہ قیام، بڑوں کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولنا اور اختلاف رائے اور احترام کو جمع کرنا اسلام کی تعلیمات ہیں اور مسلمان سب سے زیادہ اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ وہ اِن تعلیمات پر عمل کریں.

---

(5)

اور اب آخر میں اپنے اسلاف کے کچھ وہ واقعات بھی سن لیجیے جو قرون اولیٰ میں پیش آئے اور ان میں یہ سبق ملتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں ادب کا عنصر کیسا غالب تھا. ہر ایک کا احترام کیا جاتا تھا اور چھوٹے اپنے بڑوں کی عزت کیسے کرتے تھے اور بڑوں کی چھوٹوں پر شفقت کیا تھی.

حضرت عباس رضی اللہ عنہ رشتے کے اعتبار سے حضرت رسالت مآب ﷺ کے چچا تھے. اِن سے دریافت کیا گیا کہ آپ بڑے ہیں یا حضرت رسالت مآب ﷺ؟ سوال بہت واضح ہو گیا کہ عمر کا تعین

...... إذا كان ممن يستحق التعظيم، وفي "مشكل الآثار" القيام لغيره ليس بمكروه لعينه، انما المكروه محبة القيام لمن يقام له، فان قام لمن لا يقام له لا يكره. (كتاب الحظر والإباحة، قبيل فصل في البيع، ج:٩، ص:٤٦٨).

کرنا مقصود تھا۔اور جواب بھی بہت واضح ہو سکتا تھا کہ میں بڑا ہوں لیکن کلام میں ادب ملاحظہ ہو فرمایا:

هو اکبر وانا ولدت قبله. بڑے تو حضرت رسالت مآب ﷺ ہی ہیں البتہ میری ولادت ان سے پہلے ہوئی ہے۔

میری والدہ کو اطلاع دی گئی کہ آمنہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تشریف لے گئیں یہاں تک کہ جب ہم حضرت آمنہ کے پاس پہنچے تو میں نے دیکھا کہ یہ بچہ اپنے پاؤں چلا رہا ہے۔وہاں جو عورتیں موجود تھیں انہوں نے مجھے اس بچے کی طرف بڑھا دیا اور کہنے لگیں اپنے بھائی کو بوسہ دو۔[1]

کون جانتا تھا کہ یہ بچہ نبوت کا آخری شاہکار ہے اور اب کل جگ کی نجات اسی کے اتباع میں رکھ دی گئی ہے۔اس بچے کے پاؤں جن کی بوسہ گاہ ہیں وہ بہ صد ادب عرض کنندہ ہیں۔

اگر سیاہ دلم ، داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم ، گل بہار توام

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اگر ادب کا پیکر تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا ہی میں یہ بھی دکھا دیا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ سے جو اُن کے چچا ہونے کی نسبت تھی، اس نسبت کا کیسا احترام کیا جاتا تھا۔

ایک لحہ ٹھہر کر اس سوال کا جواب تلاش کرنا چاہیے کہ اس نسبت کا سب سے بڑا قدر دان کون ہو سکتا تھا؟ حضرت رسالت مآب ﷺ سے جن افراد اور اشیاء کو بہت دور دراز کی بھی نسبت تھی، کون تھا جو ہمیشہ ان نسبتوں کی لاج رکھتا رہا۔

یقیناً وہ امیر المؤمنین سیدنا فاروق اعظم سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔

اُن کا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا یہ حال تھا کہ جب یہ دونوں حضرات سوار ہوتے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر نگاہ پڑ جاتی تھی تو اپنی سواریاں چھوڑ کر اُتر پڑتے حتی کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اِن کے پاس سے گذر جاتے۔یہ عزت اور ادب اس نسبت کا تھا جو چچا ہونے کی وجہ سے حضرت عباس رضی اللہ

[1] سیر اعلام النبلاء، العباس، عم رسول اللہ ﷺ، رقم: ۱۱، ج:۲، ص:۹۷۔

عنہ کو حاصل تھی.

۱۷ھ میں خلافتِ فاروقی میں بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کے آثار نمایاں ہوگئے. امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ دعا مانگیں بارش کے لیے ارحم الرحمین کی بارگاہ میں عرض و نیاز کریں تو اُن کی نگاہیں ڈھونڈنے لگیں، کون ہے جسے اس موقع پر بارگاہ خداوندی میں پیش کیا جائے؟ آخر کار نظر جا کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر ٹھہری. اُن سے دعا کی گذارش کی اور خود یوں عرض کناں ہوئے:[1]

اللهم إنا نتوسل بعم نبيك محمد صلي الله عليه و سلم فاسقنا.

اے اللہ! ہم آپ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے وسیلے سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں سیراب فرمادے.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس نسبت کا کتنا احترام تھا، مزید بڑھیے کہ جب اپنے دور خلافت میں سب کی تنخواہیں مقرر فرمائیں تو مہاجرین کو انصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر ترجیح دی. پھر جو بدر میں شریک تھے اُن کی تنخواہ پانچ ہزار مقرر کی. پھر ان سے کم مرتبے والوں کی چار ہزار اور جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا نام آیا تو ان کی تنخواہ بارہ ہزار 12000 مقرر فرمائی. یہ جود وسخا اس ناطے کے لیے تھی، جس کا لحاظ رکھنا، ان کے نزدیک بہر حال ضروری تھا.

حضرت صہیب رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ کبھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ چومتے تھے اور کبھی پاؤں اور عرض کرتے تھے کہ پیارے چچا آپ ہم سے خوش رہا کیجیے.

پھر یہی نسبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تابعین میں منتقل ہوئی. حضرت ابو وائل رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت اور رجحان امیر المؤمنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم کی جانب تھا اور حضرت زر بن حبش رحمۃ اللہ علیہ امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف مائل تھے. یہ دونوں جلیل القدر ائمہ حدیث اور تابعین

---

[1] سیر اعلام النبلاء، العباس عم رسول الله ﷺ، رقم: ۱۱، ج:۲، ص: ۹۳.

میں سے تھے. حضرت زرؒ، حضرت ابووائل رحمۃ اللہ علیہما سے عمر میں بڑے تھے. ہمیشہ اکٹھے رہنے اور بودوباش کے باوجود کیا مجال ہے کہ کبھی ایک دوسرے سے اس موضوع پر بات کی ہو یہاں تک کہ دونوں اپنے اپنے مسلک پر انتقال فرما گئے لیکن ادب کا ایسا غلبہ تھا کہ اختلاف کے باوجود احترام کی روایت کو ترک نہیں کیا. حضرت ابووائل حضرت زرؒ رحمۃ اللہ علیہما کی عمر کا زیادہ ہونے کا احترام کرتے رہے.[1]

ان کی تربیت بھی ایسے ہی ہوئی تھی اور پھر جس جماعت کو انہوں نے دیکھا تھا وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی تو ادب کے پتلے تھے.

حضرت سید الساجدین زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ، سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کے بیٹے اور کبار تابعین میں شمار کیے جاتے ہیں. بڑے تو بڑے، راہ چلتے ہوئے عام انسان کا بھی اتنا ادب کرتے تھے کہ جب کوئی ان سے آگے چل رہا ہوتا تھا تو اسے ۔ راستے سے ہٹاتا تاکہ یہ جلدی سے گذر جائیں ۔ اس بات سے منع فرماتے تھے اور ارشاد ہوتا تھا. راستے پر چلنے کا جتنا حق مجھے بھی حاصل ہے، اتنا ہی اس کا بھی حق ہے یہ بات نامناسب ہے کہ میں اپنے گذرنے کے لیے کسی کو یہ زحمت دوں کہ وہ راستے سے ہٹ جائے.[2]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ وقت تھے، تابعی تھے لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی تعریف کرتے تھے، جب ان کی عمر کا آخری حصہ آیا تو اہل مدینہ نے پیغام بھجوایا کہ آپ مدینہ طیبہ تشریف لے آئیں اور اگر آپ کی وفات یہاں ہو جاتی ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو حضرت رسالت مآب ﷺ کے پہلو میں دفن کریں. جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم عمر بن عبدالعزیز کو اللہ تعالیٰ جہنم کے علاوہ جس عذاب میں چاہے مبتلا کر دے اگر کبھی میں نے یہ سوچا بھی ہو کہ میں اس قابل ہوں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں.[3]

کیا تواضع تھی اور کتنا ادب تھا، یہ ادب اور احترام کے رویے یہ نسبتیں ہمیں کیا سکھاتی ہیں؟

••••••••••••••••••••••••••••••

[1] سير اعلام النبلاء، زربن حبيش، رقم: ٦٠، ج: ٤، ص: ١٦٨.

[2] سير اعلام النبلاء، علي بن الحسين، رقم: ١٥٧، ج: ٤، ص: ٣٩٨.

[3] سير اعلام النبلاء، عمر بن عبدالعزيز، رقم: ٤٨، ج: ٥، ص: ١١٤.

حدیثِ وفا

اربابِ ذوق کی خدمت میں "حدیث وفا" کے عنوان سے عشق ومحبت کا ایک گراں قدر ہدیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے رنگ میں ڈوب کر یہ سطور سپردِ قرطاس کی گئی ہیں۔ مردِ خدا کے لئے متاعِ کونین سے عزیز تر اور اس کا حاصلِ حیات وہ ناطہ ہے، جو اللہ تعالیٰ اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے پیوست ہے۔

"حدیث وفا" اسی ناطے کو سرسبز وشاداب رکھنے کا سامان اور اسی عہدِ وفا کی تذکیر ہے جو صبحِ ازل میں منعقد ہوا تھا اس کتاب کا محور یہی ہے اور تمام روایات اسی مرکز کے گرد مصروفِ طواف ہیں۔

"حدیث وفا" ان دیوانگانِ عشق کے تذکرے سے بھی معمور ہے جن کی عقل کی منزل اور عشق کا حاصل رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مسعود تھا۔ وہ جس ذات کو دیکھ کر جیتے تھے اسی کے پیغام کو پھیلانے میں مر مٹے۔ ان پیکرانِ وفا کا ذکر خیر ان سے مربوط ہونے کی دلیل اور ان کے حالات اس خبر کے پیغام رساں کہ۔

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

محدثین عظام اور فقہاءِ کرام رحمۃ اللہ علیہ نے جن احادیث اربعہ کو امہات میں شمار کیا ہے "حدیث جبریل" ان میں سے ایک ہے۔

حدیث جبریل میں کامل دین کو تین شعبوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(۱) ایمان (۲) اسلام (۳) احسان

"حدیث وفا" کا قاری ذرا عمیق نظر سے جائزہ لے تو ان تینوں شعبوں کی روح جو عمل پر آمادہ اور مہمیز شوق لگاتی ہے، وہ "عشق ومحبت" ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

"حدیث وفا" اسی عشق کی بادِ بہاری کا نام ہے۔ ہر حکایت اور ہر روایت اس اصلِ حیات کو فروغ دیتی ہے۔ مصنف نے روشنائی کی بجائے عشق سے یہ ارمغان مرتب کیا ہے۔ کیا عجب کہ کسی دل کے نہاں خانے میں پھر سے یہ حدیث وفا حدیث عشق کی بھٹی سلگا دے۔

ادارہ المناد، شفیع پلازہ، بینک روڈ صدر، راولپنڈی۔

فون نمبر: 0092-51-5111725

موبائل: 0092-333-5134333